

جاسوسی دنیا نمبر 29

# لاشوں کا آپسٹار

(مکمل ناول)

## الف لیلی کی ایک رات

ہلکی سر دیوں کی ایک خوشنگوار رات تھی لیکن یہ خوشنگواری اُسی وقت تک قائم رہی جب تک  
رجٹ حید کو راستہ بھٹک جانے کا احساس نہیں ہوا۔ وہ سر شام ہی دلاور نگر سے چل پڑا تھا۔ کام  
پکھ اتنا ہی ضروری تھا کہ اس نے ٹرین کے وقت کا انتظار کرنے کے بجائے فریدی کی کار استعمال  
کی تھی۔ واپسی پر شام ہو گئی۔ تھوڑی دور تو وہ پتھر سڑک سے آیا پھر اس خیال سے کہ سفر مختصر  
ہو سکے اس نے ایک جگہ کار کو ایک پکھ راستے پر موڑ دیا۔ یہ اس نے اپنی یادداشت کے بھروسے پر  
کیا تھا۔ اس کی داشت میں ایک بار فریدی نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ بہر حال حید کو یقین تھا کہ اس  
نے کار غلط راستے پر نہیں موڑی تھی۔

اُسے شہر پہنچنے کی پکھ اتنی جلدی تھی کہ اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ کیڈ لاک جیسی شاندار  
گاڑیاں پکھ راستوں کے لئے نہیں ہوتیں۔

مطلع غبار آکوڈ ہونے کی وجہ سے چاندنی ہلکی تھی اور جنگل کے نائے سے اس کی ہم آہنگی  
بڑی دلکش لگ رہی تھی۔ حید سوچ رہا تھا کہ اگر رفیق سفر تھاںی نہ ہوتی تو اس وقت کیڈی کے  
پیوں کے نیچے کی تاہموار زمین نہ جانے کتنے جہانوں کی سیر کرادیتی اس وسیع کائنات کے رشتے  
میں پروئے ہوئے دودلوں کے کتنے راز فاش ہوتے۔ اس کے ذہن کی سطح پر کئی حسین چہرے اُبھر  
آئے اور وہ ان میں سے کسی ایک کو اپنے گرد بکھری ہوئی بیکار خوبصورتی کا ایک حصہ بنانے کے  
لئے منتخب کرنے لگا۔

بہر حال اس کا ذہن شاعران خیالات کی وادیوں میں بھکلتا رہا اور وہ خود جنگل میں..... جب  
کافی دیر ہو گئی اور وہ بد گد کا عظیم ایشان درخت نہ ملا جہاں سے اسے باہمیں طرف مڑنا تھا تو اچانک

وہ سارے شاعر انہ خیالات سرا سینگی کی دلدل میں جا پھنسے۔ اس دوران میں نہ تو اسے وقت، احساس رہ گیا تھا اور نہ بھی دھیان تھا کہ سڑک سے کتنا فاصلہ طے کرچکا ہے۔ کیڈی کے انجن سے کچھ اس قسم کی آوازیں نکلنے لگی تھیں جیسے پانی تھوڑا ہی رہ گیا ہو۔ پڑول تو خیر نیکی میں کافی تھا اور کار کے پچھے حصے میں بھی کئی میں بھرے رکھے تھے۔

اس نے کار روک دی لیکن انجمن بند نہیں کیا۔ چند لمحے کچھ سوچتا ہا پھر کار اسی طرف ہوا۔ دی جدھر سے آیا تھا۔ ایک جگہ پہنچ کر اسے دوراستے نظر آئے جو مختلف سمتوں میں چلے گئے تھے اور ان کے درمیان گھنا جنگل تھا۔ حمید کے لئے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو گیا کہ وہ ان میں سے کس راستے سے آیا تھا۔ اس نے یچھے اتر کر پہبیوں کے نشانات دیکھنے شروع کئے لیکن بد قسمی سے زیاد اتنی سخت تھی کہ وہ نشانات نہ ملنے پر اس میں سما بھی تو نہیں سکتا تھا اور آسمان تو خیر ازال سے ہو دو رہے۔

اس کی یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرنے۔ آخر کار اس نے جیپ ٹھوٹ کر ایک روپیہ نالا اور دونوں را ہوں کوڈہن میں رکھ کر ناس کیا۔ روپیہ آواز کے ساتھ زمین پر گرا اور وہ جھک کر دیکھنے لگا۔

”ہمید...!“ وہ آہستہ سے بڑھایا اور کار اسٹارٹ کر دی۔ اب وہ تن بہ تقدیر ایک راستے پر ہو لیا۔

کچھ دیر پہلے کی حسین چاندنی کفن یا کسی مقدس کنواری کی طرح بور لکھے گئی تھی۔ روپیہ چادر اور سنائی کار بٹ ٹوٹ چکا تھا۔ وہ حسین چہرے جو کچھ دیر قبل ذہن کی سطح پر ابھرے تھے جھلاہٹ کے غبار میں چھپ گئے اور وہ پختہ سڑک! وہ آدھ گھنٹہ چلتے رہنے کے باوجود بھی نہ ملی۔

کیڈی کا سنجیدہ ترین انجن پیاس سے بے قابو ہو کر شور مچانے لگا تھا۔

”شامت ہے شامت۔“ حمید نے بڑھا کر کیڈی روک دی۔

چند لمحے بے حس و حرکت بیٹھا رہا پھر یچھے اتر آیا۔

پانی کا مسئلہ بہت ضروری تھا اور سہ بھلکنے کو کیا؟ دوچار گھنٹے اور سہی لیکن پانی ہی کہاں مل جائے۔ اگر وہ سڑک ہی سڑک چلا ہوتا تو کہیں نہ کہیں کامیابی ضرور ہو جاتی۔ آتے وقت راستے میں اتر نے کئی تالات دیکھے تھے مگر بیہاں جنگل میں اگر کوئی ہوتا بھی تو ضروری نہیں کہ اس کی رسائی

اس نک ہو ہی جاتی۔

وہ کھڑا کچھ سوچ رہا تھا کہ دفعتاً سے اپنے سامنے کچھ دور پر روشنی دکھائی دی جو کچھ راستے سے اٹھ کر سامنے کی جھاڑیوں پر پھیل گئی اور پھر ایک آواز سنائی دیئے گئی جو کسی سڑک ہی کے انجن کی ہو سکتی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک تیز رفتار سڑک جھاڑیوں سے نکل کر مخالف سمت میں رُز گیا۔ حمید سوچنے لگا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ سڑک ہی کی طرف سے آئی ہو۔

وہ پھر کیڈی میں جا بیٹھا اور اسی طرف چل پڑا جدھر سے سڑک آیا تھا۔ کچھ دور چلتے کے بعد اچانک اسے پھر رک جاتا پڑا۔ یا کہنے طرف ایک کشادہ راستہ تھا۔ صرف ہمارا بلکہ باقاعدہ دونوں طرف مالٹی کی گھنی جھاڑیاں تھیں لیکن خود رو نہیں۔ ان کی کاٹ چھانٹ اور باقاعدہ گی کسی آدمی کی مر ہون مخت تھی۔ یہ راستہ ایک چھوٹے سے سلاخوں دار چانک پر ختم ہو گیا تھا جو بند نہیں تھا۔ مدھم چاندنی میں ایک سفیدی سی عمارت کے آثار نظر آرہے تھے۔ حمید کو حیرت تو ضرور ہوئی لیکن کیڈی کے لئے پانی کی ضرورت نے اسے بڑھنے نہیں دیا۔ اس نے کار موڑی اور چانک نے گذر کر پائیں باغ میں پہنچ گیا۔ جو اپنی وسعت کے اعتبار سے پائیں باغ سے بھی بڑی کوئی چیز نہیں۔ جس کے درمیان میں ایک بڑی سی عمارت تھی لیکن طول و عرض کی معاشرت سے اس کی اوپنچائی غالباً بہت ہی کم تھی۔ سامنے ایک طویل بڑا آمدہ تھا جس میں بر قی قلعے روشن تھے۔ قریب ہی کہیں سے گھر گھراہٹ کی آواز آرہی تھی جو غالباً کسی زیادہ طاقت والے ڈائنا موم کی تھی۔

برآمدے کے سامنے والی روشن پر مڑنے کی بجائے حمید نے کیڈی اسی طرف روک دی۔ برآمدے میں کوئی نہیں تھا اور آس پاس بھی کوئی نہ دکھائی دیا۔ حمید نے سوچا کہ اس جدید طرز کی عمارت میں جسے ڈائنا ہو کے ذریعے روشن کیا جاتا ہے گھنٹی ضرور ہو گی۔ وہ کیڈی سے اتر ہی رہا تھا کہ دفعتاً اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔

اگر یہ تشبیہ گھنی اور پرانی نہ ہوتی تو وہ یہی سوچتا کہ وہ چہرہ سیاہ پردے کی اوٹ سے اسی طرح لٹا چکیے بدی سے چاند نکل آئے سفید سلک کا لبلا بادھ مکورے لیتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اور اس لبادے کے اوپر سیاہ بل کھائے ہوئے گیسوں میں ایک خاباک اور سلکت ہوا سا چہرہ جس کے خدو خال آنکھوں میں گد گدی پیدا کر رہے تھے اور جب وہ برآمدے کی رُذشی کی زد سے نکل کر

روش پر اتر آئی تو حندلی چاندنی میں گویا جان پڑ گئی۔  
وہ حمید سے ایک گز کے فاصلے پر کھڑی اس کے چہرے پر نظریں جاتے ہوئے تھی اور  
کوایسا محسوس ہوا تھا جیسے اس کے اپنے جسم کی میں چلتے چلتے دفتار گئی ہو۔  
”آپ کون ہیں؟“ تیز قسم کی سرگوشی سنائی دی اور حمید کو ایسا معلوم ہوا جیسے چاندنی  
اٹھی ہو۔

”مم... مسافر...!“ وہ ہکا کر رہا گیا۔

”کیا چاہئے؟“ اس بار گھنٹیاں سی نجاحیں اور حمید یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا کہ اس کی  
میں بھی بڑی سیکس اپیل ہے۔

”پانی...!“ حمید نے کیڈی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”ختم ہو گیا ہے۔“

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کم سے کم الفاظ استعمال کرنے کی کوشش کیوں کر رہا ہے  
لڑکی واپس چلی گئی۔ ایسا معلوم ہوا تھا جیسے وہ ہولے ہولے ہوا میں تیرتی چلی جا رہی ہو۔  
حمدید نے جیب سے رومال نکال کر پہنچنے کی وہ بوندیں خلک کیں جو اس دوڑان میں اس کے  
چہرے پر بھوٹ آئی تھیں۔ دل اس طرح دھڑک رہا تھا جیسے وہ لڑکیوں کے معاملے میں با  
اندازی ہی ہو۔ اس سے پہلے کبھی اسے کسی لڑکی کا قرب نہ نصیب ہوا ہو۔

تحوڑی دیر بعد وہ پھر برآمدے میں دکھائی دی اور اس نے حمید کو اشارے سے بلایا۔  
حمدید کے قدم لا کھڑا رہے تھے۔ برآمدے کے قریب پہنچ کر وہ رک گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ  
وہی لڑکی ہے جو کچھ دیر قبل اس کے قریب چاندنی میں کھڑی تھی؟ لباس تو وہی تھا لیکن شر  
صورت کے معاملے میں اسے اپنی یادداشت پر پوچھا اعتماد تھا۔ یہ وہ لڑکی تو ہرگز نہیں تھو  
کچھ دیر قبل اسکے حواس خمسہ پر بڑی طرح چھاگئی تھی۔ البتہ اس کی آنکھیں بھی خوبناک تھیں  
”راستہ بھلک گئے ہو۔“ اس نے آہتہ سے پوچھا۔ آواز میں اتنی دلکشی نہیں تھی۔

”بھی ہاں... کیا آپ براہ مریانی کا زار کے لئے پانی دلوں میں کیں گی۔“

”مجھے یقین نہیں آتا کہ تم آدمی ہو۔“ لڑکی نے سنجیدگی سے کہا۔

”بھی...؟“ حمید کی آنکھیں جیرت سے پھیل گئیں۔

”جس بتاؤ کیا تم آدمی ہو۔“ اس بار اس کی آواز شدت جذبات سے کپکار ہی تھی۔

”اس پر میں نے ابھی تک غور ہی نہیں کیا۔“ حمید مسکرا کر بولا۔ ”اگر پانی...!...“  
”آپ کھانا بھی میرے ہی ساتھ کھائیں گے۔“ لڑکی اس کی بات کاٹ کر بولی۔ ”میں نے  
شاید پچاس سال بعد آدمی دیکھا ہے۔“  
یہ سن کر حمید کو بھی سنجیدہ ہو جانا پڑا۔ اس کے لئے یہ خیال بھی تو ہیں آمیز تھا کہ کوئی لڑکی  
اُسے گھس رہی ہو۔

”بیت تو آپ مجھے دیر تک دیکھئے۔“ حمید نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔  
”تمہارا نام کیا ہے؟“ لڑکی نے حمید کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بڑے پیار سے پوچھا۔  
”ڈومبار ستر...!“ حمید بولا۔ ”اور آپ کا۔“

”کنوں؟“ اس نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔ ”میں ایک تالاب میں اُگی تھی۔“  
حمدید بدققت تمام ہنسی ضبط کر کے بولا۔ ”اور... میں... مجھے کچھ شکاری ہمالیہ پہاڑ سے پکڑ  
لائے تھے۔ مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے۔“

”ہمالیہ پہاڑ سے؟“ لڑکی نے پر اشتیاق لبھ میں کہا۔ ”اندر چلو... یا میہیں میٹھ جاؤ۔“  
حمدید نے وہیں بیٹھنا زیادہ مناسب سمجھا۔

”ہاں تو تم کس طرح لائے گئے تھے؟“ لڑکی نے پوچھا۔  
حمدید چند لمحے غور سے اُسے دیکھتا ہا پھر بولا۔ ”کیا آپ کے والد صاحب گھر پر تشریف نہیں رکھتے۔“

”والد صاحب کیا ہوتا ہے؟“

”بہت بُرا ہوتا ہے۔“ حمید مسکرا کر بولا۔ ”اگر گھر پر موجود ہو تو آپ جیسی صاحبزادیاں  
بھی بی بی رہتی ہیں۔“

”بی بھیگ جانے پر اچھی نہیں لگتی۔“ وہ نفرت سے ہونٹ سکوڑ کر بولی۔  
”میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اگر آپ پانی دلوں دیتیں...!“

”پانی! اوہ... کھانے کے بعد۔“

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“

”تب تو آدمی نہیں معلوم ہوتے۔“ لڑکی نے مایوسی سے کہا۔  
”اچھا مجھے بھوک ہے.... منگوائیے کھانا۔“

”ہاں! کل نیے کچھ تھی اور آج کچھ ہے۔ مٹنوں میں بنتی اور بگڑتی ہے۔“ لڑکی نے کہا۔  
”غاباً اس سلسلے میں کسی انگوٹھی یا چراغ سے مددی جاتی ہوگی۔“ حمید نے انہائی سنجیدگی سے کہا  
”اوہ....!“ وہ چونک کر حیرت سے بولی۔ ”تو آپ جانتے ہیں۔“

”بیا...؟“  
”یہی کہ میں ایک جن کے قبضے میں ہوں۔“

”جی ہاں۔ میں نے آپ کے متعلق الف لیلے میں یہی پڑھا تھا۔“ حمید چڑکر بولا۔ ”ویسے کیا  
میں آپ کے والد صاحب کا نام پوچھ سکتا ہوں۔“

”والد صاحب۔“ وہ زیر لب بڑھا۔ ”آخر یہ کیا بلاتے ہے؟“  
”مجھے یقین ہے کہ اس وقت وہ بلاگھر میں موجود نہیں ہے۔“ حمید نے اور پری ہونٹ بھیجن کر کہا۔

”آپ کچھ خفا معلوم ہوتے ہیں۔“

”مجھے جلدی ہے اگر آپ پانی دلوادیں تو پڑھا تھا ویسے میں پھر کبھی بھی حاضر ہو سکتا ہوں۔“  
”میاں اتنی بڑی ہوں۔“ لڑکی تختہ سانس بھر کر بولی۔  
”آپ غلط سمجھیں مجھے جلد واپس جانا ہے۔“

حمدید کو یقین ہو چلا تھا کہ وہ پاگل ہے۔  
”طاولوت.... او طالوت۔“ لڑکی نے جھی کو آواز دی۔  
وہ پھر جھپٹ کر باہر نکلا۔  
”کھانا لاو۔“

اس نے ایک میراٹھا کران کے درمیان میں رکھ دی اور اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر  
واپس آیا۔ وہ اپنے ہاتھوں پر ایک بڑا ساخوان اٹھانے ہوئے تھا۔

جیسے ہی خوان میراٹھا کیا حمید کے دیوتا کوچ کرنے لگئے۔ خوان میں ایک بڑا سانپ کنڈلی  
مارے پھن اٹھانے بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں روشنی میں چک رہی تھیں۔  
حمدید نے بیٹھے ہی بیٹھے جست لگائی اور دوسرا لمحے میں وہ برآمدے کے پیچے تھا۔  
”بیارے... میری جان۔“ لڑکی بھیجن ہوئی بھیج۔

اس نے حمید کو دیوچ لیا اور آہستہ آہستہ کہنے لگی۔ ”یہ طالوت.... سور بر اکینہ ہے۔ تم ذرگئے؟“

”طالوت.... او طالوت۔“ لڑکی نے کسی کو آواز دی۔

”حمدید پر اختیار جھبک پڑا۔ سامنے والے دروازے سے ایک گرافٹی جبھی جھپٹ کر باہر ہے۔  
جس نے زمانہ قدیم کے جھٹی غلاموں کا سالباس پہن رکھا تھا۔ وہ سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔  
”کھانا بیٹیں لاو۔“ لڑکی نے اس سے کہا۔

جھٹی کے جانے کے بعد حمید اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔

”طالوت بڑا فادر جانور ہے۔“ وہ مسکرا کر بولی۔ ”جب میں تالاب میں اگی تھی تو یہ کوئی  
کی شکل میں کائیں کرتا ہوا میرے گرد منڈلانے لگا تھا۔“

حمدید کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کہاں آپنسا ہے۔ اس ویرانے میں اس قسم کی عمارت  
موجودگی ہی کم حیرت انگیز نہ تھی۔

”ہاں تو آپ ہمالیہ سے کس طرح لائے گئے تھے؟“ لڑکی نے پوچھا۔

”باندھ کر۔“ حمید بولا۔ ”اس وقت میرے پورے جسم پر ایک ایک فٹ لبے بال تھے۔“

”بال! لیکن اب تو نہیں ہیں۔“

” وجہ یہ ہے کہ میں روز صحیح اور سے نیچے تک شیو کر ڈالتا ہوں۔ سر پر تھوڑے سے پر  
یادگار چھوڑ دیتے ہیں۔“

”اوہ....!“

”تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر حمید بولا۔ ”اور وہ صاحبہ کہاں اگی تھیں جو آپ سے پر  
مجھے ملی تھیں۔“

”کون؟ کیا یہاں؟“ لڑکی کے لمحے میں حیرت تھی۔

”جی ہاں...!“

”لیکن یہاں تو میرے او طالوت کے علاوہ اور کوئی نہیں۔“

”تو پھر مجھے دھوکا ہوا ہو گا۔“ حمید نے لاپرواں سے کہا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اسے  
کے بیان پر یقین نہیں آیا تھا۔ ہر چند کہ وہ اسے شرارتی سمجھ رہا تھا پھر بھی اس مکان اور  
کے مکنون کے متعلق کچھ معلوم کرنے کے لئے بے چلن ہو گیا۔

”میرا خیال ہے کہ یہ عمارت زیادہ پرانی نہیں ہے۔“ حمید نے خیال انداز میں بولا۔

اور شہدیلی خوبیاں.... تمہیں شہدیلی پر اعتراض تو نہیں۔“

”نہیں! اعتراض کیوں ہوتا۔“

”میں سمجھا شاید تم اسے قواعد کے رو سے غلط قرار دے دو۔“

”محبت کرنے والے قواعد کی پرواہ نہیں کرتے۔“ لڑکی سمجھی گی سے بولی اور حمید سوچنے کا کر شاید اب اتنی ذہینت لڑکی سے کبھی ملاقات نہ ہو۔

”تو تم محبت کرنا چاہتی ہو۔“ حمید دردناک آواز میں کراہ۔ لیکن اس کی آواز دبی دبی تھی۔

اسے اس کا بھی تو خیال تھا کہ اگر بابا میاں قسم کے کوئی بزرگ گھر پر موجود ہی ہوئے تو کیا ہو گا۔  
”جیسی بجا تو تم کون ہو۔“ لڑکی اس کا ہاتھ دبا کر بولی۔

”اوہر چلو...!“ حمید نے مالتی کی طرف جھاڑیوں کی طرف اشارہ کیا۔

وہ دونوں برآمدے سے اتر کر روش طریقہ کے لان پر آبیٹھے۔ لڑکی سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”میری داستان بہت درد بھری ہے۔“ حمید ایک آہ جگہ خراش کھینچ کر بولا۔ ”آے غنچہ دہن دائے گل... اندام میں رہنے والا شہر بے نیل و مرام کا ہوں اور لوگ مجھے شہزادہ امر و بخت کہتے ہیں۔“

حمدی نے محسوس کیا کہ وہ لڑکی ایک بے تحاش قسم کے قیفی کو نہایت صفائی سے دیا گئی۔  
حمدی بو تارہ۔

”میرے باپ شہنشاہ شاخجم نصیب نے مجھے بیدا کرنے کے سلسلے میں ایک خانہ باغ ترستیب دیا اور حسب دستور نبویوں سے حکم لگاؤ دیا کہ باہر بر سر تک عورتیں میری شکل نہ دیکھنے پائیں لیکن وائے پر حال شہنشاہ شاخجم نصیب کہ جب میں پانچ ہی سال کا تھا تو ایک عورت نے مجھے اس طرح دیکھ لیا پس اُس دن سے یہ حال ہے کہ میں صحر اصر اجتنگل جنگل مارا پھر تا ہوں۔ لہذا کبھی پرول ختم اور کبھی پانی ختم۔ اس غریب الوطنی میں ایک بیس کمپنی کے ایجنت کے چکر میں پڑ کر کار بھی فریضی پڑی۔“

حمدی آہ سرد بھر کر خاموش ہو گیا۔

”کیا نوچنے لگے۔“ لڑکی تھوڑی دیر بعد بولی۔

”نہیں....!“ حمید دانت بھیج کر بولا۔ ”شاید یہ پاگل خانہ ہے۔“

”دولت خانہ۔“ لڑکی نے سمجھی گی سے تھیج کی۔

جبشی خوان اٹھا کر پھر اندر چلا گیا۔ وہ شروع سے اب تک مشین کی طرح حرکت کرتا آیا تو اس دوران میں ایک بار بھی اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا تھا۔ حمید سوچ رہا تھا کہ کیا وہ کسی جو میں چھننے والا ہے۔

”خفا ہو کر نہ جاؤ۔“ لڑکی نے اُسے برآمدے کی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

حمید کا عجیب حال تھا۔ غصہ بھی اور ندامت تیوں نے ایک ساتھ اس پر یلغار کر دی تھی۔ لڑکی اُسے پھر برآمدے میں کھینچ لے گی۔

”یہ طالوت.... واقعی بڑا مکینہ ہے میں معافی چاہتی ہوں۔“

حمدی حقیقتاً اس فکر میں تھا کہ کسی طرح نکل بھاگے۔

”تو آپ پانی...!“

”آج رات یہیں شہر جاؤ تو کیا حرج ہے۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔

”کیوں؟“

”آج وہ جن نہیں آئے گا۔“

”محترمہ! یہ بیسویں صدی ہے۔“ حمید اپنا اوپری ہونٹ بھیج کر بولا۔ ”آج کل کے لئے شرات بیکار ہے۔“

”شرات اُمیں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔“

حمدی نے سوچا کہ اس طرح سر ما نا فضول ہے۔ کیوں نہ وہ بھی انہیں خرافات پر اتر آئے لہذا وہ اپنے حرکات و سکنات میں ڈرامائی انداز پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

”میں یہ سوچ رہا ہوں کہ کیا یہ چاندنی کل بھی اتنی ہی جیسی تھی۔“ حمید کی آواز خوابیاں تھیں چاندنی...!“ لڑکی نے سکی سی لی۔

”ایسی ہی چاندنی تو تھی جب میں۔“ حمید کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”کیا؟“ لڑکی کی آنکھیں کچھ اور نشیلی ہو گئیں۔ حمید افق میں دیکھنے کی ایک نگہ کر رہا تھا۔

”وہاں.... اس پار.... جہاں بھار کے خوش گلوپرندے.... طربیہ گیت گاتے ہیں۔“

”میں یہ سوچ رہا ہوں کہ تمہیں اس رو سیاہ جن کے پنج سے کس طرح چھڑاؤں۔“  
”آہ میں اس نا بلکار خوک پیکر سے سمجھ آگئی ہوں۔“

”ایک تدبیر ذہن میں آئی ہے۔“

”کیا؟“ لڑکی نے پُر اشتیاق لجھے میں پوچھا۔

”پچھے لگاؤ کہ اس نے اپنی زندگی کا بیمه کر لیا ہے یا نہیں۔“

”نہیں کر لیا۔ میں پوچھ پکلی ہوں۔“ لڑکی ایک بیساخت قسم کی سکر اہٹ کو دبا کر بولی۔

”تب تو میں اُسے کسی بیمه ایجنت کے چکر میں پھنسا کر تمہیں صاف نکال لے جاؤں گا۔“

”چج...!“ لڑکی اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

”ایک بار میں نے بھی اسی طرح اپنی جان بچائی تھی۔“

”کیسے؟ کیا بات تھی۔“

”اب سے ایک سال پہلے کی بات ہے۔“ حمید اپنے پیارے میں تمبا کو بھرتا ہوا بولا۔ ”میں محضرا پھر تا پھر اتنا ایک شہر میں جانکلا۔ کہ نام جس کا نگار سلطانہ تھا۔ شہر پناہ کے چھانک پر بنے۔

”نے ایک جم غیر دیکھا۔ بہت سے تو...“ ہے کو پکڑے اس کی ناز برداریوں میں مصروف تھے۔ جیسے ہی میں نے چھانک میں قدم رکھا گدھے نے دولتیاں جھاڑیں اور ان لوگوں سے چھوڑ۔

”کرتیر کی طرف میری طرف آیا اور میری ناٹاگوں میں سے اس طرح نکلا کہ میں دوسرے لئے۔“ اس کی پیٹھ پر سوار تھا۔ لوگوں نے تالیاں بجا تیں نعرے لگائے اور ٹوپیاں اچھالیں۔ پھر انہوں

”مجھے گدھے پر سے اترنے نہ دیا اور مجھے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے جلوس کی شکل میں۔“ بڑھے۔ میں نے ایک شخص سے کہ مرد عقیل و فہیم معلوم ہوتا تھا اس عزت افرانی کی وجہ پر تو اس نے کہا کہ ”بھاں پناہ بادشاہ بنادیے گئے۔“

”بادشاہ۔“ لڑکی کے لجھے میں حرمت تھی۔

”ہاں! یہ اس ملک کی رسم تھی! جب بادشاہ مر جاتا تھا تو لوگ ایک گدھے کو پکڑ کر اسی بادشاہ کا انتخاب کیا کرتے تھے۔ گدھا جسے اپنے اوپر سوار کر لیتا تو ہی بادشاہ بنادیا جاتا۔ اتنی بات یقیناً بڑی اچھی تھی لیکن اس مرد عاقل نے ایک بات اور بھی بتائی ہے سن کر مجھے وجد کے

”میں گدھے سے اتر جانا پڑا۔“

حید خاموش ہو کر پاپ سلاکا نے لگا۔

”کیا بات تھی؟“ لڑکی بے چینی سے بولی۔

”اس نے بتایا کہ مرتب وقت یہ گدھا بادشاہ پر سوار ہو جاتا ہے اور اس وقت تک نہیں اترتا جب تک اس کا دم نہ نکل جائے۔ بہر حال میں نے گدھے سے اتر کر شور چانا شروع کر دیا کہ گدھے کی آنکھیں کمزور معلوم ہوتی ہیں۔“ مجھ نے کہا کہ شاید گدھے کی توہین نہیں بروداشت کی جا سکتی۔ تمہیں اس کی آنکھوں کی کمزوری کا ثبوت پیش کرنا پڑے گا۔ بات بڑھ گئی آخر فیصلہ یہ ہوا کہ گدھے کو کسی ماہر امراض چشم کے پاس لے جایا جائے۔ قصہ منحصر یہ کہ گدھے کی آنکھیں شست کرائی گئیں اور واقعی وہ کمزور نہیں۔ گدھے کے لئے چشمہ خریدا گیا۔ چشمہ لکتے ہی سمجھتے نے پھر میری ہی طرف رخ کیا۔ میں نے پھر غل غپاڑہ چیلکا کہ یہ نئے میں معلوم ہوتا ہے۔ ان لوگوں نے گدھے کو پکڑ لیا۔ کیونکہ انتخاب کی ساعت میں چکی تھی۔ انہوں نے کہا کہ انتخاب کل ہو گا۔ لیکن گدھا تھہارے ہی ساتھ رہے گا۔ تو اے ناز نین پری تمثال وہ گدھا میرے پیچے لگ گیا۔ میری کچھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس سے کس طرح چیچا چھڑاؤں۔ آخر ایک تدبیر سوجھ گئی۔ میں نے کسی بیمه کمپنی کے ایجنت کی تلاش شروع کر دی۔ تقدیر مہربان تھی کہ جلد ہی مل گیا۔ میں نے اس سے گدھے کا تعارف کرایا اور وہاں سے نودو گیارہ ہو گیا۔ پھر کافی رات گئے ایجنت کے مٹھا نے پر دوبارہ گیا۔ گدھا وہاں موجود نہیں تھا۔ میں نے وہ رات ایجنت ہی کے یہاں برس کی اور رات بھر میں سے سونے کے لائچی میں میں نے اس سے وعدہ کر لیا کہ میں بھی اپنی زندگی کا بیمه کراؤں گا۔“ دوسرا دن صبح ہی صبح میں اُسے اپنے ساتھ لے کر شہر پناہ کے چھانک پر پہنچ گیا۔ پہلے دن کی طرح آج بھی کافی بھیڑ تھی۔ گدھا چشمہ لگائے اداں کھڑا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اپنی زندگی سے بیزار ہو۔ جیسے ہی دونوں وہاں پہنچے وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا میری طرف بڑھنے لگا۔ بیمه کمپنی کے ایجنت نے لکھا رکھا اسے اپنی طرف متوجہ کیا اور اس پر نظر پڑتے ہی گدھے کا رخ پھر گیا۔ ایجنت اس کے پیچھے دوڑتا ہوا چیخ رہا تھا۔ سنتے تو سی مسٹر۔ خدارا مستقبل کے لئے کچھ تو سوچے۔ آپ کے چھوٹے چھوٹے بچے.... آپ کے بوڑھے ماں باپ.... آپ کی عزیز از جان رفیقة حیات....“ پھر گدھے نے کسی طرح جان نہ پیٹی دیکھ کر ایک کنوں میں چھلانگ لگادی۔ اس طرح میں بادشاہ بنتے بنتے بچ گیا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ وہ گدھا کثرت سے برائی کی پیتا

## آسمانی فائز

نہ جانے کب تک حمید پر وہ عجیب و غریب نیند طاری رہی۔  
دوسرے دن.... اگر سوچ کی کرنیں سیدھی اس کے چہرے پر نہ پڑتیں تو وہ سوتا ہی رہتا۔  
بہر حال نیند کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور اُسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ کیدی ہی میں سفر کر رہا تھا لیکن  
چھپلی سیٹ پر لیٹیں لیتے وہ کھڑ برا کر انھے بیٹھا۔ ڈرائیور کرنے والے کی پشت اُس کی طرف تھی اور وہ  
انپکھ فریدی کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔

چھپلی رات کے سارے واقعات حمید کے ذہن میں چکر لگا رہے تھے۔ اُس نے ایک بار پھر  
آنکھیں مل کر چاروں طرف دیکھا اور اُسے یقین آگیا کہ وہ خواب نہیں دیکھ رہا ہے۔ سیاٹھ ہی  
فریدی کی آواز بھی سنائی دی۔

”آرام فرمائیے! آرام فرمائیے آپ انھے کیوں بیٹھئے۔“

حمدی نے جست لگائی اور اُس کے برادر پہنچ گیا۔ کیدی شہر میں داخل ہو رہی تھی۔  
”میں کہاں تھا؟“ حمید نے بے ساختہ پوچھا۔

فریدی نے اُسے گھور کر دیکھا اور پھر سامنے دیکھنے لگا۔  
”میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔“ حمید نے پھر کہا۔

فریدی اپنے ہونٹ پہنچنے خاموش رہا۔ حمید کی بوکھلاہٹ اور بڑھ گئی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ  
فریدی نے اُسے معلوم نہیں کہاں اور کس حال میں پایا ہوں۔

”میں تمہارا تابولہ کراوینے کے متعلق سوچ رہا ہوں۔“ فریدی تھوڑی دیر بعد بولا۔  
”تابولہ تورات ہی کو ہو گیا ہوتا..... مگر.....!“

”میں کوئی سڑی بسی داستان یا اس حرکت کا جواز سننے کے لئے تیار نہیں۔“  
”میں کہتا ہوں میری بات تو سننے۔“

”اس کی ضرورت نہیں۔“  
”اچھا تو یہی تباہ بھج کے میں آپ کو کہاں اور کس حال میں ملا تھا۔“  
”حید! بکواس مت کرو۔“

”خدا۔ واللہ اعلم بالصواب۔“

لوگی بے تباہ نہ رہی تھی۔ حمید نے اتنی دیر میں بناوٹ کا سارا جال توڑ دیا تھا۔ وہ تھوڑی  
دیر تک ہنسنی رہی پھر یا کیک سنجیدہ ہو گئی اور مصلحت آواز میں بولی۔

”پیارے امر و بخت مجھے کسی طرح نکال لے چلو۔ ہائے یہ چاندنی رات اور اُس کا لے کلوٹ  
جن کا تصور بھی میرے لئے تکلیف دے ہے۔“

”اگر تمہیں یقین ہے کہ اُس نے اپنی زندگی کا یہہ نہیں کر لیا تو تمہیں اس قید سے رہا  
دل وادوں گا۔ دوسری بات یہ کہ اب مجھے جانا چاہئے... اور پانی۔“

”نہ جاؤ پیارے امر و بخت....!“ لوگی ٹھنک کر بولی۔

”اف فوہ! مجھے یہہ کہنی کا ایک اچھت بھی تو علاش کرنا ہے۔“

”اچھا کھانا تو کھا لو۔“

”بخشنے! اگر اس بارہ طالوت کا پچھے....!“

”اوہ! تم سمجھے نہیں تھے۔ دراصل کھانا تیار نہ رہا ہو گا۔ اسی لئے اس نے جھلا کر یہ چرک  
کی ہو گی۔“

”خیر! آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ واقعی آپ کمال کی آدمی ہیں۔ جب بھی ادھر سے  
گذرؤں گا آپ سے ضرور ملوں گا۔ اب تو آپ سنجیدگی سے اپنا تعارف کرادیجئے۔“

”لوگی حیرت بے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”میں سمجھی نہیں۔“

حمدی نے سوچا باب اسے کچھ اور سمجھانا بیکار ہے۔ پھر کہنی سمجھا جائے گا۔  
”تھوڑی دیر بعد وہ دونوں برآمدے میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ دونوں میں وہی پہلے والی  
تکنی گفتگو چھڑی ہوئی تھی۔ لیکن حمید سوچ رہا تھا کہ کھانے بہت لذیذ ہیں۔ خصوصاً شاہی ٹکڑ  
کھاتے وقت اسے سچھ نیند آئے گی۔ باہر چاندنی کی ٹنکت چادر چھپلی ہوئی تھی اور اس کی زبان،  
خوب شہود ارشادی ٹکڑے گل رہے تھے۔ آنکھوں کے پوٹوں میں گدگی ہو رہی تھی اور ریڑہ  
ہڈی میں نسرو را گیئر لہریں تھیں اس کا داہناہا تھے تجھے نسیٹ اٹھاہی رہ گیا اور اُسے گھری نیند آگئی۔

”میا ہمیشہ کے لئے۔“ حمید نے ڈرامائی انداز میں پوچھا۔  
”گٹ آؤٹ۔“

”میں کچھ نہیں کہتا۔“ حمید اٹھتا ہوا بولا۔ ”اگر آپ کسی غلط فہمی میں بٹلا ہیں تو پتلا رہے  
لیکن اتنا تو بتا دیجئے کہ آپ نے مجھے کہاں اور کس حال میں پایا تھا۔“

فریدی اُسے غور سے دیکھ رہا تھا ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ حمید کے الفاظ کو تو لئے کی کوشش  
کر رہا ہو۔

”کیوں؟“ وہ آہستہ سے بولا۔

”بات کچھ ایسی ہی ہے کہ جس پر آپ یقین نہیں کریں گے۔“

”ہوں!“ فریدی اپنے ہونٹ بھینچ کر رہا گیا۔

”میں اگلی سیٹ پر تھا لیا پچھلی پر۔“

”پچھلی پر....!“

”اور کار کہاں تھی۔“

”سرڑک کے کنارے۔“ فریدی تیز لمحے میں بولا۔

”سرڑک کے کنارے۔“ حمید نے اپنی کھوپڑی سہلاتے ہوئے دہر لیا۔

”اب کوئی ایسی داستان وہر ادو جس پر مجھے یقین آجائے۔“

”اُف فوہ! یہ تو میں پہلے ہی سے جانتا تھا کہ آپ یقین نہ کریں گے۔“

”ضرور یقین کروں گا۔ کیونکہ تمہارے ساتھ شمین کی دو خالی بو تلیں بھی تھیں۔“

”بو تلیں؟“ حمید آنکھیں پھاڑ کر بولا۔

”چلو بور مت کرو اونچ ہو جاؤ۔“

”عجیب مصیبت ہے۔“

”جاو بابا جاؤ... میری طرف سے جنم میں جاؤ۔ میں اب کسی بات کیلئے کچھ نہیں کہوں گا۔“

”میں شاید جنم سے بھی اسی طرح نکال دیا جاؤں۔“ حمید اپنے جیب میں پڑے ہوئے پاسپ کو

ٹوٹا ہوا بولا۔

”تمہارے ساتھ کون تھا۔“

”بڑی مصیبت ہے۔“

وہ دونوں پھر خاموش ہو گئے۔ حمید کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ اسے یقین تھا کہ فریدی اس کی داستان سن کر صرف قہقہے لگائے گا۔ یہ بھی اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ پچھلے رات کو اُسے بے وقوف بنایا گیا تھا۔ شاید تکڑے کھاتے وقت طاری ہونے والی غنوڈی اُسے یہ تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ پھر اُس کے بعد کیا ہوا؟ کیا فریدی اُسے اسی عمارت سے لا بایا ہے یا کہیں اور سوچتا ہا پھر کیدی گیر اج میں لے جا کر کھڑی کر دی۔

فریدی اندر ورنی پر آمدے میں ٹھیل رہا تھا اور اس کا موڈ زیادہ خراب تھا۔ حمید چپ چاپ آکر دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ فریدی نے ایک بار پھر اسے گھور کر دیکھا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ حمید کی الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر فریدی نے اُسے کہاں اور کس حال میں پایا تھا۔

وہ بھی اس کے کمرے میں چلا گیا۔

”بہتر یہی ہے کہ تم اس وقت کہیں مل جاؤ۔“ فریدی اس کی طرف مڑ کر بولا۔

”میں اسے مناسب نہیں سمجھتا۔“ حمید مسکرا کر بولا۔

”میرا موڈ بہت خراب ہے۔“

”آپ تو اس طرح تاؤ کھارہ ہیں جیسے میں آپ کی کنوٹی لڑکی ہوں۔“ حمید اوپر ہونٹ بھینچ کر بولا۔ ”اوہ آپ نے مجھے کسی غیر مرد کے ساتھ دیکھ لیا ہو۔“

فریدی پھر اسے گھورنے لگا۔

”اگر آپ فوراً ہی سیدھے نہ ہو گئے تو شاید آپ کو پچھتا پڑے۔“ حمید نے کہا۔

”بک چلو۔“ فریدی سگار سلاگتا ہوا بولا۔ ”لیکن تمہاری ان حرکتوں کی بنا پر مجھے بڑا ندامت ہوتی ہے۔“

”کن حرکتوں کی بنا پر؟“

”مجھے چڑھا رہے ہو؟“ فریدی تیز لمحے میں بولا۔

”سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو کیا ہو گیا ہے۔“

”بہتر یہی ہے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔“

”میکسی دوسرے کا سراغ بھی پایا جاتا ہے۔“ حمید نے پوچھا۔  
 ”آئینہ دیکھو...!“ فریدی نے ڈرینگ ٹیبل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔  
 حمید کو اپنے گالوں پر لپ اسٹک کے دھبے نظر آئے۔  
 ”میں بچ کہتا ہوں کہ آپ یقین نہ کریں گے۔“ حمید فریدی کی طرف مڑکر بولا۔  
 ”خیر آپ یقین کریں یا نہ کریں مجھے وہ داستان دہرانی ہی پڑے گی۔“ حمید نے کہا۔  
 اور پھر اس نے الف لیلی والی داستان شروع کر دی۔ فریدی لاپرواں سے سنتا رہا۔ نہ تو اسے  
 ہنسی آئی اور نہ اس نے کسی موقع پر حیرت ہی کا اظہار کیا جب حمید سب کچھ کہہ چکا تو فریدی کے  
 ہونٹوں پر ایک خفیہ سی مسکراہٹ کی جھلک دکھائی دی۔  
 ”یہ کہانی بیسویں صدی کے معاشرے مطابقت نہیں رکھتی۔“ اس نے کہا۔ ”لیکن شاید تم  
 نہیں جانتے کہ وہ عمارت کس کی ہے؟“  
 ”نہیں میں نہیں جانتا۔“

”اگر جانتے ہوتے تو اس سے کم از کم اس قسم کی کوئی داستان منسوب نہ کرتے۔“  
 ”کیوں؟ وہ کس کی ہے۔“  
 ”ڈاکٹر نارنگ ایم۔ پی کی۔“  
 ”ڈاکٹر نارنگ کی؟“ حمید کی آنکھیں حیرت سے بچھل گئیں۔ ڈاکٹر نارنگ وہ پھر بڑا ہوا۔  
 اُسے حقیقاً حیرت تھی۔ ڈاکٹر نارنگ نہ صرف اُس شہر بلکہ پورے ملک کے مشہور ترین  
 آدمیوں میں سے تھا۔ نہ صرف اعلیٰ حکام بلکہ وزراء تک اس کا احترام کرتے تھے۔ بہر حال یہ  
 متاخر تھا کہ وہ اس ڈرائیور سے کیا مطلب اخذ کرے جو بچھلی رات اس عمارت میں کھیلا گیا تھا۔ یہ  
 یہ بھی جانتا تھا کہ ڈاکٹر نارنگ غیر شادی شدہ تھا۔ لہذا یہ بھی نہیں سوچا جاسکتا کہ وہ اس کی لڑا  
 رہی ہو گی۔

”کیوں؟ کیا سوچنے لے؟“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”اب اصل واقعہ پہنچان کر جاؤ۔“  
 ”خدائی قسم میں نے جو کچھ بھی کہا ہے اس میں ایک فیصدی بھی جھوٹ نہیں۔“  
 فریدی اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔  
 ”خیر...!“ حمید آہستہ سے بڑا ہوا۔ ”میں پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ آپ یقین نہ کریں گے۔“

”ہیلاؤ کی... وہ نہ جانے کون تھی اور کیا تھی۔ کتنی بجیب تھی.... چال کتنی حیرت انگیز تھی۔“  
 ”حیرت انگیز نہیں بلکہ قیامت کھو۔“ فریدی منہ بنا کر بولا۔ ”تمہاری بدولت مجھے کافی  
 شرمدگی ہوئی ہے۔ پولیس کی ایک ٹشٹی لاری لے کر تمہاری تلاش میں جانا پڑا اور تم جس حال  
 میں ملے اس کا تو اس یہی تقاضا تھا کہ میں ڈوب مرتا۔“  
 ”پھر آپ نے وہی بات کہی۔“ حمید جھنجھلا کر بولا۔ ”آپ کیوں ڈوب مرتے کیا میں آپ کی  
 زوجہ محترمہ ہوں۔“

فریدی کو پھر غصہ آگیا اور حمید موقع کی نزاکت کا احساس کر کے اُس کی پیٹھے تھکنے لگا۔  
 ”خفا ہونے کی ضرورت نہیں۔“ وہ آہستہ سے بولا۔ ”ایک بار دیکھا ہے، اور دوسری بار  
 دیکھنے کی ہوں ہے میں اسی عمارت کے قریب ہی کہیں ایک جھوپڑی ڈالنے والا ہوں۔“  
 ”چھوڑو ختم کرو۔“ فریدی اکتا کر امتحنا ہوا بولا۔ ”اب اگر تم نے کبھی بلا ضرورت شراب  
 استعمال کی تو میں تمہیں دھکے دے کر نکال دوں گا۔“

”اس وقت ایشیا کا عظیم ترین سراغ رسال بچوں کی سی باتیں کر رہا ہے۔“ حمید نے ہونٹ  
 سکوڑ کر کہا اور فریدی پلٹ پڑا۔ قبل اس کے کہ وہ بچھے کہتا حمید پھر بولا۔ ”اگر میں آپ کو دلاور نگر  
 کے قریب ہی کہیں ملا تھا تو یقیناً میں نے شمپین کی دبو توںیں صاف کر دی ہوں گی۔ غصب  
 خدا کا شمپین کی دبو توںیں اور میں ابھی تک زندہ ہوں۔ کیا میں دلاور نگر کے قریب ہی ملا تھا۔“  
 ”نہیں۔“ فریدی نے بیزاری سے کہا۔  
 ”پھر کتنا فاصلہ رہا ہو گا۔“

”فضول وقت نہ بر باد کرو۔“ فریدی لاپرواں سے بولا حمید کے خیال دلانے پر وہ بھی اس  
 مسئلے پر سمجھدی گئی نے غور کرنے لگا تھا۔ حمید اسے دلاور نگر سے تقریباً پینتیس چالیس میل کے  
 فاصلے پر ملا تھا۔ شمپین کی دبو توںیں صاف کر دینے کے بعد اتنی دور کا سفر شاید فولاد کے آدمی سے  
 بھی نہ ہو سکتا اور یہ چیز بھی تقریباً ناممکن تھی کہ حمید نے اتنا سفر کر کچنے کے بعد رک کر دو  
 بو توںیں پی ڈالی ہوں۔ یہ بات فریدی بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ حمید شراب کا عادی نہیں ہے۔  
 دوسری بات یہ کہ اگر کوئی عورت وہاں اس کے ساتھ آئی اور اسی کی ترغیب پر حمید نے یہ حرکت  
 کر دالی تو پھر وہ خود کہاں گئی۔ ظاہر ہے کہ وہ اتنی دور پیدل تونہ گئی ہو گی۔

فریدی نے پھر حمید کی طرف دیکھا جو اس طرح ہونٹ سکوڑے بیٹھا تھا جیسے سیٹی بجانے، ارادہ کر رہا ہو۔

“آج تمہیں پاگل نانے میں داخل ہوتا ہے۔” فریدی نے سمجھی گئی سے کہا۔

“میا...؟” حمید بے ساختہ اچھل پڑا اور فریدی کے ہونٹوں پر شرات آمیز مسکراہٹ دوڑ گئی۔ “پاگل... خانے... میں۔” فریدی ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ ساجد حقیقتاً پاگل نہیں ہے۔“

“کون ساجد؟“

“کرتل فرید والا کیس بھول گئے۔“

“کرتل فرید۔” حمید اپنے ذہن پر زور دیتا ہوا بولا۔

“چھ ماہ قبل کی بات ہے۔” فریدی نے کہا۔ ”بھلا تمہیں کیوں یاد ہو گی۔ کرتل فرید جو پراسرار طریقے پر قتل کر دیا گیا تھا اور جس کی بہن غائب ہو گئی تھی۔“

“نہ جانے کتنوں کی بہنیں روزانہ غائب ہوتی رہتی ہیں۔ میں کہاں تک خیال رکھوں۔” حمید مسکرا کر بولا۔

”تب پھر تمہیں اس کیس کی تفصیل کہاں یاد ہو گی۔ معاملہ تقریباً ادب ہی گیا تھا۔ لیکن کل رات کو...!“

دفتاریلی فون کی گھٹتی بجی۔ فریدی نے رسیور اٹھایا۔

”بیلو! فریدی بول رہا ہے.... ارے۔“

فریدی کے ہاتھ سے رسیور چھوٹ پڑا۔ اور اس نے مضطربانہ انداز میں اسے پھر اٹھایا۔ ”بیلو... بیلو... کہاں... کیسے؟... آتا ہوں۔“ وہ رسیور رکھ کر تیزی سے حید کے طرف مڑا۔

”چلو...؟“ وہ دروازے کی طرف بھاگا۔

حمدی اس کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔

گیراں سے کار نکالنے والے اس کے ہاتھ کا نپ رہے تھے۔ حمید نے کبھی اسے اس حال میں نہیں دیکھا تھا۔

”کیا بات ہے۔“ اس نے گھٹی گھٹی سی آواز میں پوچھا۔

”وزیر خزانہ۔“ فریدی تھوک نگل کر بولا۔ ”وزیر خزانہ بھرے جمع میں قتل کر دیے گئے۔“

”بھرے جمع میں۔“ حمید اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

کیڈیلاک سڑک پر فرائٹ بھرتی رہی اور وہ دونوں خاموش رہے۔ نہ تو حمید نے یہ پوچھا کہ یہ حادثہ کہاں ہوا اور نہ ہی فریدی نے بتایا۔ اس کی آنکھیں وڈا اسکرین پر جب ہی ہوئی تھیں اور ہاتھ اسٹرینگ پر حرکت کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ اور بقیہ جسم قطعی بے جان معلوم ہوتا تھا۔

حمید کار میں لگے ہوئے آئینے میں دیکھ دیکھ کر اپنے چہرے سے لپ اسک کے دھبے صاف کر رہا تھا۔

”اپنے بیہاں سے کس کس کی ڈیوٹی تھی۔“ حمید نے ٹھوڑی دیر بعد پوچھا۔

”کئی انپکٹر تھے، پر شنڈنٹ بھی تھے۔ بڑی حیرت کی بات ہے۔ وزیر خزانہ کی مخالفت کہیں بھی نہیں تھی۔ نیک تام وزراء میں سے تھے۔“

”یہ حادثہ کہاں ہوا۔“

”یونیورسٹی میں... وہ شعبہ فلکیات کا افتتاح کر رہے تھے۔ تفصیل نہیں معلوم ہو سکی۔“

”قتل ضرور پکڑ لیا گیا ہو گا۔“ حمید بولا۔

”قاتل...!“ فریدی آئسٹر سے بڑا بڑا۔ ”کسی نے شاید قاتل کی شکل بھی نہ دیکھی ہو۔“

”کیوں...؟“ حمید چونک کر بولا۔

”میں اس وقت تمہیں یہی بتانے جا رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجھے گی تھی۔“

”کیا؟“

فریدی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی پیشانی پر سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں۔

اگر کوئی اور موقعہ ہوتا تو حمید اس کی خاموشی پر جھنجھلا جاتا۔ لیکن خود اس کا ذہن اس بڑی

طرح الچھ گیا تھا کہ اسے اپنے سوال کا دھیان تک نہ رہا۔

یونیورسٹی کی کپاؤٹ پولیس والوں سے بھری تھی۔ ہر طرف سرخ گیزیاں اور خاکی ٹوبیاں نظر

اڑی تھیں۔ خصوصاً جلسہ گاہ جو کئی بڑے بڑے شامیاں پر مشتمل تھی عجیب افراتفری کا عالم

تھا۔ فریدی اور حمید بھیڑ میں گھستے چلے گئے۔ ڈاکس کے گرد پولیس آفیسروں نے گھیرا اڈا دیا تھا۔

ڈاکس پر شہر کے اعلیٰ حکام اور کچھ معززین سرگوشیاں کر رہے تھے۔ انہیں میں فریدی کے بھائی آئی۔ جی اور ڈی۔ آئی۔ جی بھی تھے۔ ڈاکس کے دامنے سرے پر ایک مددگار پیشواد عائیں پڑھ رہا تھا۔ فریدی کو دیکھ کر ڈی آئی جی نے اسے ڈاکس پر آنے کا شارة کیا۔

گولی مقتول کی پیشانی پر لگی تھی۔ حمید نے لاش پر سے اپنی نظریں فوراً ہی ہٹالیں۔ بدجنت کے متعلق سوچ رہا تھا جس نے اتنے اچھے آدمی کو موت کی آنکوش میں دھکیل دیا تھا۔ میر میں ان کی علم و دستی اور خدا ترسی کی دھوم تھی۔ نہ جانے کتنے یتیم اور بیوائیں انہیں کے سہارہ زندگی ببر کر رہی تھیں۔

فریدی تھوڑی دیر تک لاش کی طرف دیکھتا رہا پھر ڈی۔ آئی۔ جی اسے ڈاکس کے اتار لے گیا۔ حمید بھی ساتھ تھا۔

”میں نے ہی تمہیں فون کیا تھا۔“ ڈی۔ آئی۔ جی فریدی سے کہہ رہا تھا۔ ”اف میرے خوب نہ جانے وہ کیا بلا تھی۔ میں یہیں موجود تھا۔۔۔ وہ تقریر کر رہے تھے۔“

”قاتل۔۔۔؟“ فریدی نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ”ہبھاں کا قاتل، کیسا قاتل، نہ جانے وہ کیا چیز تھی۔ شکل تو رائق جیسی نہیں تھی۔ آواز ویسی ہی تھی۔“

فریدی نے خیال انداز میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”ظضا میں تیرتی ہوئی آئی تھی۔“ ڈی۔ آئی۔ جی کہتا رہا۔ ”بس ایک لمحہ ڈاکس کے سات معلق رہتی اور آڑی سبل منظر دسرے لمجھ میں نیچے تھے۔“

”اور وہ پھر اسی طرح واپس گئی جیسی آئی تھی؟“ فریدی نے کہا۔ ڈی۔ آئی۔ جی اثبات میں سر ہلا کر بولا۔ ”پھر میں نے تو دیکھا نہیں۔ لوگوں کا بیان ہے۔“ تیر کی طرح اور پھر چڑھتی چلی گئی۔ اور پھر نظریوں سے غائب ہو گئی۔

حمدید سوچ رہا تھا کہ کیا فریدی پہلے ہی سے واقع تھا۔ اس کا یہ جملہ کہ کسی نے شاید قاتل شکل بھی نہ دیکھی ہو۔ اسی پر دلالت کرتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔

”آڑی سبل منظر تقریر کر رہے تھے؟“ فریدی نے پوچھا۔ ”ہاں انہوں نے تقریر شروع ہی کی تھی۔“

”مایک سے کتنے فاصلے پر تھے۔“

”وہی جو فاصلہ عموماً کھا جاتا ہے۔“

”مایک کہاں گیا؟“ فریدی مضطرباً انداز میں چاروں طرف دیکھتا ہوا بولا۔

”مایک..... بھی مایک سے کیا۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے بے دلی سے کہا۔ ”پڑھنے میں اس افرافری میں کیا ہوا۔“

”میں مایک کو چیک کرنا چاہتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے کسی کے حواس درست نہیں۔ تمہیں کیا الزام دوں۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے کہا اور پھر ڈاکس کی طرف چلا گیا۔

فریدی مجھساتھ نظریوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔

”آخ رہا ٹھیک کیوں۔“ حمید آہستہ سے بولا۔

فریدی نے کوئی جواب نہ دیا وہ بھی ڈاکس کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے ڈاکس پر کھڑے ہو کر چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔

”اوہ۔۔۔!“ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور وہ ڈاکس سے اتر کر سیدھا اس طرف پہنچا جہاں ملائکروfon کے لوازم اکٹھا تھے۔ وہ چند لمحے ان کا جائزہ لیتا رہا پھر حمید سے بولا۔

”تم سیئیں ٹھہر دو۔۔۔ یہ ساری چیزوں کی روکی جائیں گی۔“

”وہ پھر ڈی۔ آئی۔ جی کے پاس والیں آیا۔“

”میں نے وہ سارا اس سامان رکو ٹھیک کیا ہے؟“

”کون سا۔۔۔؟“ ڈی۔ آئی۔ جی نے پوچھا۔

”مایکروfon کے لوازمات۔“

”بھی اس سے کیا ہو گا۔“ ڈی۔ آئی۔ جی جھنجھلا کر بولا۔

”کیا وہ مشین اتنی بڑی تھی کہ اس میں کم از کم ایک آدمی بیٹھ سکے۔“ فریدی نے سوال کیا۔

”نہیں اتنی بڑی نہیں تھی۔“

”تب پھر مشین اپنی آنکھ سے نہیں دیکھتیں۔ میڑو کمپنی میں جہاں سے ماکروfon آیا ہے۔“

پہلی فرصت میں پھرہ لگانا چاہئے تاکہ کوئی چیز اور ہر سے ادھرنہ ہونے پائے۔“

"اور...! اے۔ آئی۔ جی اسے غور سے دیکھنے لگ۔  
"جلدی پہنچ۔" فریدی نے کہا اور بھیڑ میں غائب ہو گیا۔

## دوسراء حملہ

ایک گھنٹے کے اندر اندر پورا ملک سر ایمگی کا شکار ہو گیا تھا۔ اخبارات کے خیلے چھپ رہے تھے۔ شہر میں تو ایسا نہایت خاصیت ہے۔ آئی۔ جی کی آواز پھر سنائی دی۔ کرو ہے تھے۔ راہ گیر بر گوشیوں میں گفتگو کرتے اور ہر سڑک پر فوجی دستے گزر کر رہے تھے۔ مسکراہٹ بھی آئی تو وہ دوسرے ہی لمحے میں چونک کراس طرح سنجیدہ ہو جاتا ہے اس سے یہ لاش کے سرہانے سرزد ہوئی ہو۔

دزیر خزانہ بہت اچھے آدمی تھے اور جب کوئی بہت اچھا آدمی قتل کر دیا جاتا ہے تو کاغذ ذرہ ذرہ سو گوار معلوم ہونے لگتا ہے۔ ہوا میں لک آہیں بھرنے لگتی ہیں۔ عام آدمیوں سے زیادہ وہ لوگ پریشان تھے جن کی ذمہ داری مقتول کی جگہ سے سلامت واپس جانے ہی پر ختم ہو سکتی تھی۔ ملکہ سراغ رسانی کی عمارت کے بڑے کمرے میں سب اکٹھا تھا۔

آئی۔ جی کا چہرہ اترنا ہوا تھا اور اس کے گرد بیٹھے ہوئے دوسرے آفیسر ایک دوسرے سر گوشیاں کر رہے تھے۔ چند لمحے پیشتر ان کے درمیان۔۔۔ گما گرم بجھیں ہوئی تھیں اور فیصلہ ہوئے بغیر ختم بھی ہو گئیں تھیں۔

اہن آسمانی را نکل کامسلہ اتنا آسان نہیں تھا کہ چند گھنٹوں کی نشست میں اس کی تباہ پہنچا جاسکتا۔ اس کے متعلق تو اتنا بھی نہیں معلوم ہو سکا تھا کہ وہ آئی کس سمت سے تھی اور کس سمت۔ دیکھنے والے صرف اتنا بتا سکتے تھے کہ وہ ایک لبے اور لمبائی کی مناسبت سے بہت چوڑے صندوق کی شکل کی تھی۔ فائیر کی آواز ایسی ہی تھی جیسی کسی را نکل کی ہوتی ہے۔

انپکٹ آصف انپکٹ ماہر کی طرف جھکا ہوا آہستہ کہہ رہا تھا۔ "ش لاک" ہوڑ کے صاحب نہار دیں۔ خواجوہ میڑو والوں کے پیچے پڑ گیا ہے۔ میرے شیر کی ہربات نزالی۔"

۔۔۔ بھلما نائک و فون سے اس کا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔"  
انپکٹ ماہر کوئی جواب دینے کے بجائے دوسری طرف متوجہ ہو گیا۔ آئی۔ جی اپنی بھاری کر کھرتی آواز میں کہہ رہا تھا۔ "یہ درست ہے کہ اس آسمانی حرబے کے سامنے بھی بے بن تھے لیکن سوال تو یہ ہے کہ کسی ایسے حرబے کا وجود ہی کیوں! آخر ہم سب کس لئے ہیں۔ مجھے اپنے ٹھکے پفر تھا۔"

کوئی کچھ نہ بولا۔ سب کو جیسے سانپ سو ٹگھ گیا ہو۔

"مجھے سب سے زیادہ خلکیت تم سے ہے۔" آئی۔ جی کی آواز پھر سنائی دی۔ اور ان سب کی نظریں دروازے کی طرف اٹھ گئیں کیونکہ آئی۔ جی اور ہر ہی دیکھ رہا تھا۔ دروازے میں انپکٹ فریدی دکھائی دیا۔ اس کے پیچے سرجت حمید تھا۔ دونوں کے چہروں سے تھکن کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں کچھ نہ کر سکا۔" فریدی نے آہستہ سے کہا اور ایک خالی کر سی پر بیٹھ گیل حمید کے ریک کا کوئی آدمی میٹنگ میں موجود نہیں تھا۔ اس لئے وہ اٹھ پاؤں واپس چلا گیا۔

"ما نائک و فون کا کیا حصہ تھا؟" آئی۔ جی نے پوچھا۔

"ایک خیال پیدا ہوا تھا۔ لیکن فی الحال کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکا۔ دیے میں اب بھی ہیں کہاں ہوں کہ اس خادعے کا کچھ نہ کچھ تعلق مانیک و فون سے ضرور ہے۔"

"کیوں؟"

"ابھی سائنس نے اتنی ترقی نہیں کی کہ مشینیں آدمی کی قوت ارادی کی پابند ہو جائیں۔ وہ مشین کی میکانیکی ہی سُم کے تحت چلتی ہوں گی۔"

فریدی خاموش ہو گیا۔

"ٹھیک ہے! کہتے جاؤ۔" آئی۔ جی بولا۔ "میں سمجھ رہا ہوں۔ وہ یقیناً واڑ لس ہی سے کٹرول کی جاتی ہو گی۔"

"اور اس میں میلی ویژن سُم کا بھی داخل معلوم ہوتا ہے۔" فریدی نے کہا۔

"ای لمحے میں ما نائک پر زور دے رہا ہوں۔"

"کیوں؟"

دے دیا اور وہ آدمی دوسراما نیکرو فون لے آیا۔“

”اوہ....!“

”لیکن جلسہ گاہ میں بعد کو جو ما نیکرو فون ملے۔ اس میں کوئی خاص بات نہ تھی۔“

”خاص بات؟“

”یعنی ان کا سکیفر م وہی تھا جو عام طور پر ہوتا ہے۔“

”اس دوسرے آدمی کا پتہ چلا۔“ آئی۔ جی نے پوچھا۔

”جی نہیں! اس میٹرو کے نیجر کا بیان ہے کہ دوسرا کوئی ما نیکرو فون جلسہ گاہ میں گیا ہی نہیں اور نہ اس صورت و شکل کا کوئی آدمی اس تک پہنچا تھا۔ دوسراما نیکرو فون جو جلسہ گاہ میں ملا تھا اس کے متعلق اس نے بتایا کہ وہ میٹرو سکپنی کا نہیں تھا۔ ویسے اس پر میٹرو سکپنی ہی کا نام درج تھا۔ میٹرو لاڈا پیکر سروس۔“

آئی۔ جی تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا۔ پھر آہستہ سے بولا۔

”حقیقتاً تم ملکے کی ناک ہو۔“

فریدی کے ساتھیوں کے منہ چڑھ گئے لیکن ذی۔ آئی۔ جی بے اختیار مسکرا پڑا تھا۔ یہ مسکرا ہٹ کچھ ایسی ہی تھی جیسے کوئی باپ اپنے بچے کی تعریف کسی دوسرے سے سن کر کھل اٹھے۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر آئی۔ جی نے کہا۔

”توب کیا کرنا چاہئے۔“

”ڈی۔ آئی۔ جی صاحب میرے طریقہ کار سے بخوبی واقف ہیں۔“ فریدی تھوڑے توقف کے بعد بولا۔

اس پر ڈی۔ آئی۔ جی کی طرف جگ کر آہستہ سے کچھ کہا اور آئی۔ جی پر خیال انداز میں سر ہلانے لگا۔

کچھ دیر پورے کرے میں سر گوشیاں ہوتیں رہیں پھر آئی۔ جی کی آواز سنائی دی۔

”بہر حال آپ لوگ اپنی آنکھیں کھلی رکھتے۔ یہ کیس خاص طور سے کسی کے سپرد نہیں کیا جاتا ہے۔ ہر ایک کو کوشش کرنی ہے۔“

اس مختصر سی ہدایت کے بعد مینگ، برخاست ہو گئی۔ سب چلے گئے لیکن فریدی وہیں

”اگر ہم یہ نہیں تشیم کرتے تو پھر ہمیں یہ مانا پڑے گا کہ وہ کسی آدمی کی قوت ارادی یعنی پابند ہے۔ اسے چلانے والے نے سوچ لیا کہ آزیبل مشر کو ختم کرتا ہے۔ لہذا وہ مشین ان تلاش میں چل پڑی۔“

آئی۔ جی کچھ نہ بولا۔ شاید اسے فریدی کا الجہ ناگوار گزرا تھا۔

”شاید آپ کو وہ اڑن کم یاد نہیں۔“ انپکٹ آصف فریدی کو مخاطب کر کے بولا۔ ”جو مجھ بجگ عظیم میں جرمنوں نے استعمال کئے تھے۔“

”اڑن کم...!“ آئی۔ جی آصف کو گھوڑنے لگا۔ ”ان کا یہاں کیا سوال؟“

”اڑن بول کا ستم دوسرا تھا۔“ فریدی نے آصف کو مخاطب کیا۔ ”ان کی اڑان اور اس میں سمت اور فاصلے کے تعین کو دخل تھا۔ اس لئے وہ بعض اوقات غلط جگہوں پر بھی گر پڑتے ہیں۔ فرض کیجئے وہ برلن سے لندن کے لئے روانہ ہو گئے تو وہ ادھر اور ہر جگہتے ہوئے لندن کی پہنچیں گے۔ انہیں کنٹرول کرنے والی مشین انہیں لندن کی سمت برلن اور لندن کے درمیں فاصلہ کا تعین کر کے روانہ کرے گی۔ بس اتنے ہی فاصلے پر کیجئے کرو گر جائیں گے جا ہے وہیں ہو چاہے کوئی اور جگہ۔ سمت کے تعین۔ ”راسی بھی غلطی انہیں لندن کے بجائے کہیں اور اسکتی ہے۔“

”نیز متعلق بحث سے کیا فائدہ۔“ آئی۔ جی نے اسے ٹوکا۔

”ہاں تو جتاب والا میں یہ عرض کر رہا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ آزیبل مشر کے گرنے افراتفری کے دوران میں ما نیکرو فون بدل دیا گیا۔“

آئی۔ جی حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ ”وہ شخص جو میٹرو سکپنی کی طرف سے ما نیکرو فون پر یا مور تھا، حرast میں ہے۔“ فریدی بولا۔ ”اس کے بیان سے معلوم ہوا ہے کہ جلسہ شروع ہونے سے آدھا گھنٹہ قبل ما نیکرو خراب ہو گیا تھا۔ اس نے اسے بنانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوا۔ اتنے میں ایک آدمی یہ تجویز پیش کی کہ سکپنی سے دوسرے انگوالیا جائے جو نکل ما نیکرو فون کی دیکھ بھال کرنے والے اس لئے اس نے خود جانا مناسب نہ سمجھا۔ اس پر اس نامعلوم آدمی نے کہا کہ اگر وہ ما نیکرو طلبی کے لئے تحریر دے دے تو وہ منتوں میں لاسکتا ہے۔ محافظ نے نیجر کے نام ایک پڑھا۔

موجود رہا۔  
اب بتاؤ۔ ذی۔ آئی۔ جی فریدی کی طرف مخاطب ہوا۔ آئی۔ جی کی نظریں بھی اس  
میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ اب سے چھ ماہ قبل کسی نے اسے اس کی کوئی ہی میں قتل کر دیا۔ اس کی  
بین قتل والی رات ہی سے غائب ہے اس کا پارائیٹ سیکریٹری اس حادثے کے بعد پاگل ہو گیا تھا  
جو آج بھی پاگل خانے میں ہے۔ بہن کرمل ہی کے ساتھ رہتی تھی۔

”لیکن اس معاملے سے اس کا کیا تعلق.....؟“ آئی۔ جی اکتا کر بولا۔  
”میں نے بچھلی رات اس را نکل کو پرواز کرتے دیکھا تھا۔“ فریدی نے کہا۔  
”کیا....؟“ دونوں بیک وقت بولے۔

”اور میرا خیال اُسی طرف گیا تھا۔“  
”تو کیا تم پہلے ہی سے اس کے متعلق جانتے تھے۔“ آئی۔ جی نے پوچھا۔  
”تھوڑا ابہت۔“

”پھر بھی تم نے کچھ نہ کیا؟“  
”کل رات سے قبل مجھے اس کے وجود پر یقین نہیں تھا۔“ فریدی نے کہا۔ ”حقیقتاً کل رات سے قبل مجھے اس کے وجود پر یقین نہیں تھا۔“ فریدی نے کہا۔ ”حقیقتاً کل رات سے قبل مجھے یقین والث نہیں تھا۔ اس کا تو اس وقت خیال آیا جب میں نے حادثے کی خبر سنی تھی۔  
بھی مجھے یقین والث نہیں تھا۔

”تم نے اُسے کہاں دیکھا تھا؟“  
”شہر کے اتری حصے میں وہ زیادہ بلندی پر نہیں تھی۔“

”مکہر گئی تھی؟“  
”مشرق کی سمت!“ فریدی نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ وہ لوگ اس کا امتحان کر رہے تھے۔  
”تو کیا تم ان لوگوں سے بھی واقف ہو۔“

”جی نہیں۔“  
”بہر حال تم نے اپنی معلومات کو چھپا کر اچھا نہیں کیا۔“ آئی۔ جی کا لبجہ ناخن ٹکٹکوار تھا۔  
”جناب والا.... معلومات کی نوعیت ہی ایسی نہیں تھی کہ جس پر فوری ایکشن کیا جائے۔“

”یعنی....!“  
”فریدی نے ذی۔ آئی۔ جی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”آپ کو کرمل فرید کا کیس تیار ہو گا۔“  
”کرمل فرید۔“ ذی۔ آئی۔ جی ذہن پر زور دیتا ہوا بولا۔ ”وہ جس کی بہن....؟“

”جی ہاں! وہی....!“  
”کیا کیس تھا؟“ آئی۔ جی نے پوچھا۔

”خوفناک ہنگامہ“ جلد نمبر 8 ملاحظہ فرمائی۔

”کرمل فرید! ایک ریسائزڈ فوجی تھا۔“ فریدی بولا۔ ”دولت مند گر شریف قسم کے لوگوں  
میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ اب سے چھ ماہ قبل کسی نے اسے اس کی کوئی ہی میں قتل کر دیا۔ اس کی  
بین قتل والی رات ہی سے غائب ہے اس کا پارائیٹ سیکریٹری اس حادثے کے بعد پاگل ہو گیا تھا  
جو آج بھی پاگل خانے میں ہے۔ بہن کرمل ہی کے ساتھ رہتی تھی۔“

”وہی عرض کرنے جادہ ہوں۔“ فریدی نے کہا۔ ”ایک ہفتہ قبل کی بات ہے کہ ایک ایسے  
آدمی سے ملاقات ہوئی جو کرمل کے پرانے ساتھیوں میں سے تھا۔ دورانِ گفتگو میں اس سے پتہ  
چلا کہ کرمل ایک اچھا میکینک اور انجینئر بھی تھا۔ وائر لیس اور ٹیلی دیشن اس کے محظوظ ترین  
موضعات تھے اور وہ پچھلے کئی سالوں سے اس فکر میں تھا کہ انہیں کی بنیادوں پر کوئی حرہ بیان  
کرے اس وقت میں نے اس بیان کو کوئی اہمیت نہ دی تھی لیکن جب بچھلی رات پرواز کرتی ہوئی وہ  
شے نظر آئی تو قدرتی طور پر اس شخص کے الفاظ مجھے یاد آگئے۔“

”کیس کا انچارج کون تھا؟“ آئی۔ جی نے پوچھا۔

”غالباً انگلیز سندھیر۔“ فریدی نے کہا۔ ”میں اس زمانے میں گارسائی والے معاملے میں  
البجا ہوا تھا۔ بہر حال کرمل کے قتل کی نہ تو آج تک وجہ معلوم ہو سکی اور نہ قاتل ہی کا سراغ ملا  
اور اس کی بہن کی حریت انگلیز روپوٹھی ابھی تک پر دہ راز میں ہے۔ سندھیر کا خیال ہے کہ شاید وہ  
ہمیں قتل میں شریک تھی۔ لیکن میں واقعات کی روشنی میں ایسا سمجھنے کے لئے تیار نہیں۔ کرمل کا  
سیکریٹری پولیس کو عجیب حالت میں ملا تھا۔ کرمل کی بہن کے بستر پر خون کے چھوٹے چھوٹے  
دھبے تھے اور وہ اس طرح بے ترتیب تھا کہ جیسے اس پر بسوئے والے کو کسی سے جو جدوجہد کرنی پڑی ہو۔“

”نوكر کہاں تھے۔“ آئی۔ جی نے پوچھا۔

”شاگرد پیشہ میں جو کوئی سے کافی فاصلے پر ہے اور انہیں صحیح ہی اس حادثے کی اطلاع ہوئی تھی۔“  
”کچھ اس کا بھی اندازہ ہے کہ ان تمام معاملات میں کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔“ آئی۔ جی نے پوچھا۔  
”فی الحال کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“

”کافی دریک مکان میں تیوں میں بھیں ہوتیں رہیں۔ لیکن آخر میں نتیجہ وہی صفر، نہ کوئی فیصلہ  
کوں کا اور نہ طریق کا رہی کا تعین کیا جا سکتا۔“

”خوفناک ہنگامہ“ جلد نمبر 8 ملاحظہ فرمائی۔

فریدی نے اطمینان کا سانس لیا۔ حمید کے گولی نہیں گئی تھی۔ کھڑکی کے شیشے کے گلروں نے اس کا چہرہ زخمی کر دیا تھا اور خود فریدی کی پیشانی کا زخم بھی انہیں گلروں کے لگنے کا نتیجہ تھا۔ اس نے ردمال سے اپنا چہرہ صاف کیا اور راگھیر سے بولا۔

”ٹھیک ہے! اب ٹھیک ہے۔“

”کسی نے اس پہلی کار سے گولی چلانی تھی۔“ دوسرے نے کہا۔ ”میں نے خود دیکھا تھا۔ یہ کیا تفت آگئی ہے اس شہر میں۔“

”گولی! نہیں کسی شریر پہنچنے پر چھپیکا تھا۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”ہمال کرتے ہیں آپ ارے جتاب میں نے خود دیکھا تھا۔“

”آپ کو دھوکا ہوا ہو گا۔“ فریدی نے آہستہ سے کہا اور کار اسٹارٹ کر دی۔ راگھیر حرمت سے ایک دوسرے کامنہ دیکھتے رہ گئے۔ کیڈیلاک سول ہسپتال کی طرف جا رہی تھی۔

حمد تھوڑی دیر بعد کہ مسیایا اور کراہ کر سیدھا ہو گیا۔ سامنے لگے ہوئے آئینے پر نظر پڑتے ہی ایک ہلکی سی جیج نکلن گئی۔ اس کا سارا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

”چھوٹا مت۔“ فریدی آہستہ سے بولا۔ ”لگبراؤ نہیں زخم گھرے نہیں ہیں۔ نہیں۔ نہیں۔ کر جیس معلوم ہوا جیسے اس کے کان کے قریب ہی ایک فائز ہوا ہو۔ دوسرے ہی لمحے میں فریدی کی جیج سنائی دی اور حمید کے چہرے پر لا تعداد چھپریاں سی آکر لگیں کیڈیلاک ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔

”یہی فکر مت کرو۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”بس تقدیر ہی تھی۔۔۔ ورنہ۔۔۔ گولی میرے دلہنے شانے کو چھوٹی ہوئی نکل گئی ہے۔ اگر کوٹ میں شولڈر پیڈنہ ہوتا، تو ہڈی صاف تھی۔ البتہ پچھلی سیٹ بر باد ہونے کا افسوس ہے۔“

حمید نے پلٹ کر دیکھا۔ پچھلی سیٹ میں بڑا سو رخ تھا۔

”تو کیا وہی را لفٹ لیتھی تھی۔“ حمید بوكھلا کر بولا۔

”نہیں گولی ایک کار سے چلانی گئی تھی۔“

”کار سے۔“

”ہاں اور وہ محض تمہاری وجہ سے نکل گئی۔ میں سمجھا شاید تم اللہ کو پیدا ہو گے۔“

فریدی کے دوسرے ساتھی مائیکروfon کے محافظ کے بتائے ہوئے علیے سے چھٹے ہوئے تھے وہ انہیں ریٹائرمنٹ روم میں چھوڑ کر مسکراتا ہوا باہر آگیا۔

شہر کی حالت اب تک ویسی ہی تھی۔ ویرانی اور سوگواری میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ فریدی کی کیڈیلاک تیزی سے سڑک پر پھنس لیتھی تھی۔ حمید اور وہ خاموش تھے غالباً وہ دونوں اس سے بھی بے خبر تھے کہ ایک دوسری کار کیڈیلاک کا تعاقب کر رہی ہے۔

”فی الحال ساجد ہی والی کڑی اپنے ہاتھ میں ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”کون ساجد۔“ حمید نے پوچھا۔

”وہی کرٹل فریدی کا سیکریٹری جو پاگل خانے میں ہے۔ اس سے کرٹل کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم ہوا کتا تھا۔ بنے ہوئے پاگلوں کو راہ راست پر لانا براہد شوار کام ہے اور کرٹل کی بہن، نسرا غانہ تو اُس کا کوئی فونو ہی دستیاب ہوا کتا اور نہ مکمل حلیہ! حلیے کے متعلق اختلاف بیانیاں پڑ جاتی ہیں۔ البتہ ایک چیز سب کے بیانات میں مشترک ہے اور وہ ہے اس لڑکی کی چال۔ سب کو کہتے ہیں کہ چلتے وقت وہ زمین سے کچھ اوپر تیرتی ہوئی سی معلوم ہوتی ہے۔“

”کیا؟“ حمید بے ساختہ اچھل پڑا۔ لیکن اس کی حرمت ایک سیکنڈ بھی قائم نہ رہ سکی۔ یونک اسے ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے کان کے قریب ہی ایک فائز ہوا ہو۔ دوسرے ہی لمحے میں فریدی کی جیج سنائی دی اور حمید کے چہرے پر لا تعداد چھپریاں سی آکر لگیں کیڈیلاک ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔

”یہ حادثہ ایک سنسان سڑک پر ہوا تھا۔ دو ایک لوگ جو ادھر سے گزر رہے تھے فریدی کے کار کی طرف جھپٹے۔ فریدی اپنی پیشانی دبائے حمید پر جھکا ہوا تھا۔ جس کا سر سیٹ کی پشت سے مٹ کر ایک طرف ڈھلک گیا تھا۔ حمید کے چہرے پر کئی جگہ خون رس رہا تھا اور وہ بے ہوش ہوا تھا۔ فریدی نے اسے سنبھالنے کے لئے اپنی پیشانی سے ہاتھ ہٹالیا اور اس کے چہرے پر بھی خون کی چادر پھیل گئی۔“

”ٹھہریے۔ ٹھہریے۔“ ایک راگھیر اس کی مدد کے لئے لپکا۔ چار پانچ آدمی کار کے گرد ہو گئے تھے۔

کھڑکی کا شیشہ چکنا چور ہو گیا تھا۔

”کاش گولی میرے ہی گلی ہوتی۔“ حمید شنڈی سانس بھر کر بولا۔ ”اب میرے چہرے پر  
شمارنگ کے داغ ہوں گے اور کوئی لڑکی میری طرف دیکھنا بھی گوارانہ کرے گی۔“

”لڑکی....!“ فریدی نے منہ بنا کر کہا اور پانچلا ہونٹ دانتوں میں دپالیا۔  
”ہائے۔“ حمید آہستہ سے کراہا۔

”میں نے ماںکروں کے مقابلے میں ہلچاکر غلطی کی تھی۔“ فریدی بولا۔

## پُر اسرارِ مسٹر کیو

اُس حیرت انگیز رائل کے متعلق نہ صرف شہر یا ملک بلکہ ساری دنیا میں چہ میگویا  
ہو رہی تھیں۔ خصوصاً شہر کے لوگ تو بُری طرح سبھے ہوئے تھے۔ ملک کی سر بر آور دہستیار  
خوف اور اندریشوں کا شکار ہو گئی تھیں۔

دوسرے دن کے اخبار نے وزیر خزانہ کے قتل کے ساتھ ہی محلہ سراغِ رسانی کے  
بہترین افراد پر حملہ کی بھی خبر چھپائی تھی۔ اخبار پیچے والے گلی کوچوں میں چیختے پھر رہے تھے۔  
”محلہ سراغِ رسانی کے دو آفیسروں پر بھی قاتلانہ حملہ، دونوں آفیسر اپنے زخموں  
ڈرینگ کرنے کے بعد حیرت انگیز طریقے پر غائب ہو گئے۔“

یہ فریدی اور حمید کے زخمی اور غائب ہونے کی خبر تھی۔ انہوں نے سول ہفتاں میں اپنے  
زخموں کی ڈرینگ کرائی تھی اور پھر اپنے محلے کے اعلیٰ آفیسروں کو اطلاع دیئے بغیر روپوش ہو گئے  
تھے۔ اخبارات کی اطلاع تو دراصل یہی تھی لیکن عام آدمی اسے کیا سمجھتے کہ اسی دن محلہ سراغِ  
رسانی کے ڈی۔ آئی۔ جی کی کار دلاور نگر کی طرف کیوں جا رہی تھی۔

ڈی۔ آئی۔ جی کے ساتھ پرمنڈٹ اور دو انسپکٹر بھی تھے۔ ڈی۔ آئی۔ جی خود کار ڈرائیور  
کر رہا تھا۔ پہنچیں میں پنچھے سڑک پر چلنے کے بعد کار ایک کپے راستے پر مڑ گئی۔ پھر وہ اُس عمارت  
میں داخل ہوتی دکھائی دی جس میں سرجنت حمید نے ایک حیرت انگیز رات گزاری تھی۔

ڈاکٹر نارنگ اسم۔ پی عمارت میں موجود تھا۔ اُسے محلہ سراغِ رسانی کے آفیسروں کو  
کوٹھی میں دیکھ کر حیرت نہ ہوئی کیونکہ وہ مقتولِ نشر کے گھرے دوستوں میں سے تھا۔

ڈاکٹر نارنگ دوہرے بدن کا ایک لمبا ترٹھا آدمی تھا۔ عمر بچا اور سماں کے درمیان میں رہی  
ہو گی۔ لیکن صحت مند ہونے کی بنا پر یہ کہنا و شوار تھا کہ وہ بڑھاپے کی سرحدوں میں قدم رکھ چکا  
ہے۔ وہ آہستہ آہستہ گفتگو کرنے کا عادی تھا اور دورانِ نگتوں میں اپنی نظریں مخاطب کے چہرے  
سے ہٹائے رکھتا تھا۔ اس کے متعلق مشہور تھا کہ اُسے کبھی کبھی سے کرخت آواز آواز میں گفتگو کرتے  
ہوئے نہیں سنائیا۔

”میں اُن تمام لوگوں سے مل رہا ہوں۔“ ڈی۔ آئی۔ جی کہہ رہا تھا۔ ”جن سے مقتولِ نشر  
کے قریبی تعلقات تھے۔“

”میں بھی انہی بد نصیبوں میں سے ایک ہوں۔“ ڈاکٹر نارنگ کی آواز کلکپاگی۔  
پھر ڈی۔ آئی۔ جی کافی دیر تک مقتول کے دوسرا دوستوں کے متعلق پوچھ چکھ کر تارہا۔  
اور جب واپسی کیلئے بالکل تیار تھا تو اُس نے اچانک ڈاکٹر نارنگ سے کہا۔ ” مجھے ایک شکایت بھی ہے۔“  
”کہے۔“ ڈاکٹر نارنگ نے میز پر رکھے ہوئے گلدان کی طرف نظر جاتے ہوئے کہا۔  
”یہاں پر سوں رات کو میرے محلے کے ایک آدمی کے ساتھ بڑا خطرناک مذاق کیا گیا۔“

”یہاں....!“ ڈاکٹر نارنگ چونک پڑا۔ ”میں نہیں سمجھا۔“  
”وکسی صاحبزادی نے اُسے کوئی نشہ اور چیز کھلا دی تھی۔“  
”صاحبزادی نے۔“ ڈاکٹر نارنگ کے لہجے میں حیرت تھی۔

”جی ہاں، وہ راستہ بھلک کر ادھر نکل آیا تھا۔“

”اُسے غلط فہمی ہو گئی ہو گی۔ یہ حدادش کہیں اور پیش آیا ہو گا۔“

”اُسے یقین ہے؟“

”تب اس نے خواب ہی دیکھا ہو گا۔“ ڈاکٹر نارنگ مسکرا کر بولا۔ ”یہاں ہمیشہ اس عمارت کا  
منظوم چند نوکروں کے ساتھ رہتا ہے اور وہ بھی میری ہی طرح تجد کی زندگی بس رکھ رہا ہے۔ میں  
زیادہ تر شہر میں رہتا ہوں۔ کبھی کبھی ادھر بھی آنکھ تھوں۔ پر سوں میں یہاں نہیں تھا۔ یہاں کسی  
لڑکی کی موجودگی سرے ہی سے م محکمہ خیز معلوم ہوتی ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ اس طرف اس ساخت کی کوئی اور عمارت نہیں۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے کہا  
”نہیں۔“

”اس نے بالکل بھی نقشہ بتایا تھا۔ جو میں اس عمارت کا دیکھ رہا ہوں۔“ ذی۔ آئی۔ جی بو۔  
”مجھے حیرت ہے۔“

”اس نے ایک جبشی غلام کا بھی تذکرہ کیا تھا۔“

”جبشی غلام۔“ ذاکٹر نارنگ بے ساختہ پس پڑا۔ ”تب تو اس نے حقیقتاً خواب دیکھا ہو گا۔“

”وہ لڑکیاں تھیں۔“ ذی۔ آئی۔ جی۔ اس کی بات نظر انداز کر کے بولا۔ ”ان میں سے ایک:  
ایسی تھی جسے ہم عرصہ سے تلاش کر رہے ہیں۔“

ڈاکٹر نارنگ یک بیک سنجیدہ ہو گیا اور پھر اس نے کسی کو آواز دی۔ چند لمحے بعد ایک قدر  
صورت نوجوان اندر داخل ہوا۔ جس نے سر کا سوت پین رکھا تھا اور گردن میں شوخر رنگوں والی  
تائی تھی۔

”پرسوں رات کو یہاں کون تھا۔“ ذاکٹر نارنگ نے اس سے پوچھا۔

”جج..... جی..... کوئی بھی تو نہیں..... کوئی نہیں۔“ منتظم ہکلانے لگا۔

”بھروسہ مت بولو۔“

”تی کوئی نہیں..... میں ..... سس ..... جج .....!“

”ہکلا کیوں رہے ہو... کوئی ضرور تھا۔“ ذاکٹر نارنگ کی آواز بلند ہو گئی اور سیکریٹری کا ہنپتے لگا۔

”جج..... جی..... سس ..... معافی چاہتا ہوں۔“

”کون تھا.....؟“

”ڈاکٹر کٹر ناگر.....!“

”یہ کیا بلا ہے۔“

”فلم ڈاکٹر، میرا دوست ہے۔ اور ہر شوونگ کی غرض سے آیا تھا۔ میں نے آپ کی اجازت  
کے بغیر ٹھہرایا تھا۔ معافی چاہتا ہوں۔“

”کوئی جبشی بھی تھا ان کے ساتھ۔“ ذی۔ آئی۔ جی نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“

”اوہر دلڑکیاں بھی۔“

”جی نہیں صرف ایک تھی کنوں۔“

”کسی مسافر کو یہ تو فہ بیلایا گیا تھا؟“ ذاکٹر نارنگ نے پوچھا۔

”جی ہاں.... وہ کنوں کی شرارت تھی..... میں منع کرتا رہا۔.... مگر؟“

”اُسے کوئی نشہ اور چیز دی لگی تھی۔“ نارنگ نے پوچھا۔

”نشہ آور.... اورہ.... شاید وہ اسی لئے سو گیا تھا۔“

”صاف صاف بتاؤ۔“

”اُسے یہ تو فہ بانے کا پروگرام کنوں ہی نے بنایا تھا۔“ منتظم نے کہا اور شروع سے آخر  
نہیں پوری داستان دہرانے کے بعد بولا۔ ”کنوں اور جبشی کے علاوہ کوئی اور اُس کے سامنے نہیں  
گیا۔ پھر کنوں نے اُسے کھانا کھلایا اور کھاتے ہی کھاتے وہ سو گیا۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کوئی نشہ اور  
چیز تھی۔ پھر ہم اُسے اسی کی کار میں ڈال کر سڑک پر چھوڑ آئے تھے۔“

”تم جانتے ہو کہ تم لوگوں نے کتنا برا جرم کیا ہے؟“ نارنگ بولا۔ ”اگر وہ سائب اُسے کاٹ لیتا تو۔“

”جی.... دراصل اُس میں زبر نہیں تھا۔ ناگر اُسے کسی میں کی شوونگ کے لئے لایا تھا۔“

”لیکن کسی کو کوئی نشہ اور چیز کھلادینا بھی جرم ہے۔“

”میں معافی چاہتا ہوں۔“ منتظم گزگز لایا۔

”لوگیاں دو تھیں۔“ ذی۔ آئی۔ جی نے پوچھا۔

”جی نہیں ایک تھی۔“

”تمہاری بدولت مجھے ذلتِ نصیب ہوئی۔“ ذاکٹر نارنگ کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا وہ  
ڈی۔ آئی۔ جی کی طرف مژ کر بولا۔ ”آپ اسے لے جائیے اور جو کار وائی مناسب سمجھئے بیجئے۔ مجھے  
کوئی اعتراض نہ ہو گا۔“

”میں معافی چاہتا ہوں۔“ منتظم پھر گزگز لایا۔

”دوسری لڑکی کون تھی۔“ ذی۔ آئی۔ جی نے گرج کر پوچھا۔

”جج..... جی..... دوسری لڑکی ..... مم..... ناگر کی محبوہ تھی۔“

”تم نے اب تک اُسے چھپایا کیوں تھا۔“

”وہ..... نن..... ناگر.....!“

”گھبراو نہیں۔“ ذی۔ آئی۔ جی نرم لمحے میں بولا۔ ”میں نارنگ جی کی بدنامی کے خیال سے

تمہیں در میان میں نہ لاوں گا۔“

منظم تھوڑی دیر تک سر جھکائے کھڑا رہا۔ پھر تھوک نگل کر بولا۔ “پہلے وہی لڑکی باہر آئی تھی پھر اس نے اندر جا کر اس مسافر کا تذکرہ کیا۔ تاگر اندر تھا اس نے جھاٹک کر باہر دیکھا اور کنوں سے تھوڑی دیر تک سر گوشیاں کرتا رہا۔ پھر اس نے کنوں کو باہر بچع کر اس لڑکی کو ایک کمرے میں بند کر دیا۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگا کہ وہ مسافر دراصل ایک ایسا ریس ہے جو اس کی محبوبہ پر ڈورے ڈالنے کی فکر کر رہا ہے.... وہ اُسے اچھی طرح یو تو قوف بنا کر رخصت کرے گا۔ اس کے بعد اس نے مجھ سے کہا کہ میں اس لڑکی کا تذکرہ کسی سے نہ کروں کیونکہ وہ اسے بعض پر ڈیوسرول سے چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔“

”تمہیں اس لڑکی سے گفتگو کرنے کا تقاضہ ہوا تھا۔“

”جی نہیں وہ بہت کم گفتگو کرتی تھی اور اس کی آنکھوں.....!“

”ہاں ہاں کہو! گھبراؤ نہیں۔“

”اس کی آنکھوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بیداری میں بھی کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔“

”تم ناگر کو کب سے جانتے ہو۔“

”پچھلے ماہ اس سے شہر میں ملاقات ہوئی تھی۔“

”یہاں پہلی بار آیا تھا۔“

”نہیں دوسرا بار۔ اس سے پہلے بھی اس نے یہاں دو تین دن تک قیام کیا تھا۔ لیکن اس وقت وہ اکیلا ہی تھا۔“

”اس کا پتہ۔“

”سولہ پرنس اسکواز..... دولت گنج۔“

”سپرنشنڈنٹ نے پہنچنے کیا اور ذہی۔ آئی۔ جی نے ہاتھ کے اشارے سے گفتگو کا سلسلہ ختم کر دیا۔“

”جاو۔۔۔!“ ڈاکٹر نارنگ سیکریٹری کو گھورتا رہا۔ پھر ذہی۔ آئی۔ جی بولا۔ ”مجھے اس واقعے پر افسوس ہے۔“

”اب بہتر بھی ہے کہ تم اپنابسٹر گول کرو۔“

”حضور میں بتاہ ہو جاؤں گا۔“ ”منظم گزر گزایا۔“

”تمہیں بیس منٹ کے اندر اندر کو ٹھی چھوڑ دینی ہے۔“ ڈاکٹر نارنگ نے خنک لبھے میں کہا اور اٹھ کر باہر چلا گیا۔

منظم اس کے عادت و اطوار سے اچھی طرح واقف تھا اور اس لبھے کو خوب سمجھتا تھا۔ چاروں ہزار اس نے اپنی ضروری چیزوں ایک سوٹ کیس میں بھریں اور باہر نکل آیا۔ ڈاکٹر نارنگ مالتی کی جماڑیوں کے قریب آم کے درخت کے نمائے میں کھڑا تھا۔ اس نے منظم کو جاتے دیکھا اور منہ پھیر لیا۔

سوٹ کیس وزنی تھا۔ کبھی وہ اُسے ہاتھ میں لٹکاتا اور کبھی کاندھے پر رکھ لیتا۔ ہاتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی سوچتا جا رہا تھا کہ کب تک اور کہاں تک اس طرح جائے گا۔

کچھ راستے کے دوسرے موڑ تک پہنچنے پہنچنے اس کے دونوں ہاتھ شانوں سے علیحدہ ہوتے معلوم ہونے لگے۔ ہر حال کسی نہ کسی طرح وہ پہنچنے سڑک تک پہنچ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کھڑا جائے۔

و�탏ست مخالف سے ایک کار آتی دکھائی دی۔ چونکہ وہاں سکرین سورج کے سامنے نہیں تھا اس لئے کار ڈرائیور کرنے والے کا چہرہ صاف نظر آرہا تھا۔ اس کے پھرے پر سرست کی لہر دوڑ گئی اور وہ ہاتھ اٹھا کر چھپا۔ ”ناگر...!“

کار اس کے قریب آکر رک گئی۔

”نیلو راجن... کہاں؟“ کار ڈرائیور کرنے والے نے کہا۔

”ارے یار کیا بتاؤ۔۔۔ شاید اس وقت پیدل ہی شہر جانا پڑتا۔“

”بھلا کیوں؟ ٹلو سوٹ کیس اندر رکھ دو۔“

راجن نے پچھلی سیٹ کی کھڑکی کھول کر سوٹ کیس رکھ دیا۔ اب اس نے دیکھا کہ پچھلی سیٹ پر ایک آدمی اور بھی تھا۔ اس نے مسکرا کر سوٹ کیس رکھوانے میں مدد دی۔ راجن کے لئے صورت نبی تھی۔

”اوھر آجائو۔“ تاگر نے اگلی سیٹ کی کھڑکی کھولتے ہوئے کہا۔

راجن بیٹھ گیا اور کار چل پڑی۔ رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔

”پولیس تمہاری تلاش میں ہے۔“ راجن ہانپتا ہوا بولا۔ ”تمہاری ہی وجہ سے مجھے ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑے۔ میں تمہیں منع کر رہا تھا۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی تھی۔ وہ آدمی دراصل محکم سر اور سانی کا کوئی آفسر تھا۔ یاد رکھ بتاؤ وہ لڑکی کون تھی۔“

ناگر پہنچنے لگا۔ ”پرواہ مت کرو پیارے۔ میرا بہت بڑا... کاروبار ہے۔“

”مگر... میں نے پولیس کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ البتہ تمہارا پتہ بتاتے وقت مجھے ہوش آگی تھا... اور میں نے صحیح پتہ نہیں بتایا۔“

”کسی بات کی فکر مت کرو۔“ ناگر بدن جھٹک کر بولا۔

”یاد رکھ بتاؤ، وہ لڑکی کون ہے۔“

”میری محبوبہ! میں اُسے کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتا۔“

”کہیں سے بھگا کر لائے ہو۔“

”ہاں...!“ ناگر نے کہا اور اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا۔

کار ایک کچھ راستے پر مڑ گئی۔

”اوہر کہاں؟“ راجن نے پوچھا۔

”جلد پہنچیں گے کم از کم دس میل کا فرق پڑ جائے گا۔“

راستہ آٹھ دس فٹ سے زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ دونوں طرف سرکندوں کی اوچی اوچی اور گھنی جھاڑیاں تھیں۔

”اور کیا پوچھا تھا پولیس والوں نے۔“

”اور تو کچھ بھی نہیں لیکن جرت ہے کہ انہوں نے مجھے اس خیال سے گرفتار نہیں کیا کہ اس میں ڈاکٹر نارنگ کی بدناہی تھی اور ڈاکٹر نارنگ نے مجھے اس طرح نکال دیا۔“

”فی الحال تم شہر میں کہاں جاتے۔“ ناگر نے پوچھا۔ کیا کوئی تمہارا دوست یا عزیز وہاں ہے۔“

”کوئی نہیں! میں تمہارے ہی پاس جاتا اور پھر کوئی اور انتظام کرتا۔“

ناگر نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا۔ تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر راجن بولا۔

”یار وہ کتوں بڑی تیر لڑکی ہے۔“

”کیوں... کہیں عاشق تو نہیں ہو گئے اس پر۔“ ناگر نے بحمد اللہ اساقہ پر لگایا۔

”پچھے نہیں کیوں وہ میرے ذہن پر نہی طرح چاہی ہے۔“

”تو پھر عشق اور کسے کہتے ہیں۔“

”عشق بہت اوچی چیز ہے۔“ راجن سمجھ دی گئی سے بولا۔

رفعت راجن کے پیچھے بیٹھے ہوئے آدمی نے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن کپٹلی۔ راجن نے ترپ کر پلٹنا چاہا لیکن دوسرا سے لمجھے میں اس کے منہ پر ایک گھونسہ پڑا... اور کارکر کی۔ ہاڑ کے اندر شدید قسم کی جدو جہد ہو رہی تھی۔ ناگر نے دوسرا گھونسہ مارا اور راجن کی نکسیر نوٹ کی لیکن وہ بھی کمزور نہیں تھا۔ اس نے پیچھے بیٹھے ہوئے آدمی کے ہاتھ اپنی گردن سے ہٹادیے تاگر۔ نے پھر ہاتھ اٹھایا لیکن اس بار اسی کا جڑبہ راجن کے ہاتھوں بیکار ہو گیا۔

راجن کا راستے پیچے کو دیکھا۔ وہ دونوں بھی اس کی طرف جھوٹے لیکن شاید راجن ٹوٹنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ بے تباہ ایک طرف دوڑنے لگا... وہ دونوں اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ وفتحاڑا ہنی طرف کی جھاڑیوں سے ایک فائر ہوا۔ راجن نے بھاگتے بھاگتے چیخ کر ایک جست لکائی اور گر کر تڑپنے لگا۔ اس کی کنپی سے خون کا فوارہ نکل رہا تھا۔

تعاقب کرنے والے رک کر ایک دوسرا سے کامنہ دیکھنے لگے۔ پھر دونوں اس طرف جھوٹے جدھر سے فائر ہوا تھا۔ جھاڑیاں سننا پڑی تھیں۔ البتہ ان میں بارود کی بیکنی سی بوچھلی ہوئی تھی۔ دونوں چدی لمحے اوہر اور ہر دیکھتے رہے پھر راجن کی طرف لوٹ آئے جو خمٹدا ہو چکا تھا۔ انہوں نے کارا پچھلا حصہ کھول کر پڑوں کے تین کنتر نکالے اور انہیں لاش پر خالی کرنے لگے۔

”تھے جانے کون تھا؟“ ناگر کے ساتھ والے نے کہا۔

”مسڑ کیوں (Q) کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے۔“

”مسڑ کیوں؟“ دوسرا کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”آخر یہ مسڑ کیوں ہے کون؟“

”کام کرو کام۔“ ناگر نے مظہربانہ انداز میں کہا۔ کہیں تمہاری کھوپڑی میں بھی چھٹاںک بھر سکتے نہ اتر جائے۔“

”یار میں نکل آگیا ہوں... اس کام سے۔“ دوسرا بولا۔

”معلوم ہوتا ہے.... یاد رکھی... موت منڈلار ہی ہے تمہارے سر پر۔“

پڑوں ڈال دینے کے بعد وہ لاش سے دور ہٹ گئے۔ پھر ناگر نے ایک دیا مسلمی سلاک کر لاش

کی طرف اچھا لدی۔ دوسرے ہی لمحے میں وہاں آگ ہی آگ تھی۔ والپی پرانہ کار میں ایک پرچہ ملا جس پر تحریر تھا ”اپنے کام سے کام رکھو! اور حکم کی تعیین کرو! مسٹر کیو کے متعلق پچھے ہے“ موت کو دعوت دینا ہے۔“

## حمدید پاگل خانے میں

سرجنٹ حمید نے چیخزے لگا کر کھے شے۔ آنکھوں میں دھشت تھی اور شیو بڑھا ہوا انہیں بالے ترتیب تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ان میں برسوں سے تیل نہ پڑا ہو۔ سر میں خس و خاکھار اور گرد و غبار کا عالم یہ ظاہر کر رہا تھا جیسے وہ حقچ پاگل ہو۔ چہرے پر متعدد چھوٹے چھوٹے زخم تھے جن پر کھرند جمنے لگی تھی۔ اس کے شناساؤں میں سے اگر کوئی اُسے اس حال میں دیکھ لیتا تو ہرگز ز پیچاں سکتا۔

وہ تین دن سے اس موقع پر شہر بھر میں مارما را پھر رہا تھا کہ شاید کوئی اللہ کا بندہ اُسے پاگل خانے بھجوادے۔ لیکن وہ ابھی تک تو اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ اس دوران میں اس نے متعدد شرارتیں کی تھیں مگر لوگوں نے اسے پاگل خانے بھجوادی نے کی بجائے اس کی حرکتوں میں خاصی دلچسپی لی۔ عموماً اس کے پیچے ہر وقت چھوٹے چھوٹے بچوں کی خاصی بھیز ہوا کرتی تھی۔ اس نے فریدی سے کہا کہ اس در درسری سے کیا فائدہ، براہ راست اسے پاگل خانے میں بھجو دیا جائے۔ لیکن فریدی نے اسے مناسب نہ سمجھا۔ فریدی کا کہنا تھا کہ بجمم بہت منظم معلوم ہوتے ہیں۔ ذرا سی غلطی پوری ایکسیم پر پانی پھیر سکتی ہے۔

جس دن سے ان دونوں پر حملہ ہوا تھا فریدی بہت زیادہ حکماں ہو گیا تھا۔ خود روپوشنی اختیار کر کے اسی نے ڈی۔ آئی۔ جی سے استدعا کی تھی کہ وہ ڈاکٹر نارنگ سے مل کر حمید والے معاملے کی تحقیق کرے... اور یہ معاملہ قابو کافی روشنی میں آچکا تھا کہ وہ لڑکی جو حمید کو اس عمارت میں پہلے نظر آئی تھی کرنی فرید کی روپوشن بہن نادرہ ہی تھی۔ ڈی۔ آئی۔ جی نے ڈاکٹر نارنگ کے نیجے سے جو پتہ حاصل کیا تھا وہ سرے علی سے بیکار ثابت ہوا۔ اس عمارت میں ناگر نام کا کوئی آدمی نہیں رہتا تھا اور فلیں دنیا میں بھی کوئی اس نام سے واقع نہیں تھا۔ نہ کوئی نامی کسی ایکثریں ہی کا سارا

بل کا اور اس بھر نے تو ڈی۔ آئی۔ جی کی رہی کسی امیدوں پر پانی ہی پھیر دیا کہ ڈاکٹر نارنگ نے اپنے نیجے کو اسی دن بر طرف کر دیا تھا۔ بہر حال اب راجمن کی بھی تلاش جاری تھی۔

ان دو تین دنوں کے دوران میں حمید کو بعض اوقات ایسا محسوس ہونے لگتا جیسے وہ حقچ

پاگل ہو گیا ہو۔ وہ قریب ہر وقت دعائیاں کرتا تھا کہ اے پاک پروردگار اپنی پاگل فرست میں پاگل خانے بھجوادے۔ ورنہ یہ پیچھے پیچھے تالیاں بجاتے ہوئے چلنے والے شریر بچے مجھے کچھ پاگل بنادیں گے۔ اپنی ایکسیم کامیاب ہوتے تھے دیکھ کر اس نے کئی بار سچا کہ اب عورتوں کو بھی چھینا شروع کر دے لیکن پھر خیال آیا کہ عورتوں کو چھیرنے والے کو کسی طرح معاف نہیں کیا جاتا خواہ پاگل آدمی ہو خواہ پاگل کتا۔ بعض اوقات تو لوگ ایسے پاگل کتے کو بھی مار مار کر آدمی بنا لیتے ہیں۔

آج صبح ہی سے وہ ادھر ادھر اچھل کو دھچاتا پھر رہا تھا۔ کسی کو مسکرا کر آنکھ مارتا، کسی کو منہ چڑھا اور کسی کو چوچ دکھاتا۔ صبح ہی صبح اس نے سب سے پہلی شرارت یہ کی تھی کہ ایک چورا ہے کے گول چھوڑتے پر جا چڑھا تھا۔ ٹریک کا سپاہی موجود نہیں تھا۔ اس لئے اس کے فرائض انجام دینے میں کوئی دشواری نہ ہوئی۔ وہ ناخن اسی کر گزرتی ہوئی کاروں کو گزرنے اور رکنے کے اشارے کر تاں ڈرائیور ہنس نہ کر اسے گھونسہ دکھاتے اور گزرنے۔

وہ تقریباً آدمی ہے گھنٹے ٹکیں کرتا رہا۔ پھر ڈریوٹ والا ٹریک کا نیشل آگیا اور اس نے بدقت تمام اسے چھوڑتے سے ہٹایا لیکن وہ بھی اسے پاگل خانے بھجوادی نے پر آمادہ نظر نہیں آتا تھا۔ حمید دل یہ دل میں اسے گالیاں دے کر وہاں سے بہت گیا۔

لیکن آج اس نے تمہیر کر لیا تھا کہ وہ پاگل خانے ضرور جائے گا۔

بڑے چوک میں پیچ کر کچھ اُسے اپنی قسمت جاگتی معلوم ہونے لگی۔ اس نے ڈسٹرکٹ محسٹریٹ کو دیکھا جو اپنی کار سے اتر کر فٹ پاٹھ پر چڑھ رہا تھا۔ حمید نے سوچا کہ یہ آخری موقعہ ہے۔ اگر یہ بھی ہاتھ سے نکل گیا تو پھر مرتے دم تک پاگل خانے کا دیدار نصیب نہیں ہو گا۔

”ہائے جانی سنو تو کسی۔“ حمید ڈسٹرکٹ محسٹریٹ کے پیچھے لپٹتا ہوا بولا۔

ڈسٹرکٹ محسٹریٹ چلتا رہا۔

”اویلی ہیت... پٹ میری جان... ہائے رک جانی... نیلی ہیت... نیلی ہیت۔“

نہلے پاگل خانے کے منتھلوں نے اس بیگانے کو فرو دیا۔  
تھوڑی دیر بعد حمید کا طبی معافانہ شروع ہوا جو اتنی جلدی اور لاپرواٹی سے ختم کر دیا گیا کہ  
یہ کو جھرت ہونے لگا۔

پتہ نہیں ڈسٹرکٹ محسریت کے دل پر کیا گذر رہی تھی۔ البتہ اس کے ڈائیور نے پھر ہر حال ڈاکٹر نے رپورٹ میں لکھا کہ وہ ایسا پاگل نہیں تھا جسے کہیں الگ باندھ کر رکھا  
کر حمید کی گردن پکڑ لی اور حمید اس سے لپٹ پڑا۔

وہ صحنی ٹوپی پر مشتمل تھا۔

اسے باغ میں نئی کیاریاں کھو دنے اور کھاد دالنے پر لیگا دیا گیا۔

حمید کی نظریں اُسے ڈھونڈ رہی تھیں جس کے لئے وہ یہاں آیا تھا۔  
اس کے ساتھ اور بھی کئی آدمی اُسی کام پر لگے ہوئے تھے۔ وہ انہیں بار بار گھورنے لگتا تھا کہ  
فرانہیں پاگل کیسے سمجھ لیا جائے۔ وہ سب نہایت سنجیدگی اور خاموشی سے اپنے کاموں میں

اُسے ڈپنسری والے سائبان کے نیچے ایک قائم پر بٹھا دیا گیا۔ اچانک ایک صاحب جو کافی بے صرف تھا۔

دنعتاباً غ کے باہر اس جگہ شور سنائی دیا جہاں کچھ پاگل رسیاں بٹ رہے تھے۔ حمید اچھل کر  
تڑنگے تھے اُس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گئے۔ حمید کا دل دھڑ کے لائیں ساتھ دیا وہ یہ بھی سوئے۔  
فرانہ گیا۔ ایک ایک پاگل ایک درخت کے بتنے سے چھٹا ہوا جیخ رہا تھا۔ ”مار ڈالوں گا۔۔۔ سالے  
تھا کہ وہ خود بھی تو پاگل ہے۔ اگر کسی سے ہاتھا پائی کی نوبت آگئی تو اسے تکلیف سے کرنا پڑے گی۔“

وہ صاحب تھوڑی دیر تک حمید کو گھورتے رہے پھر انہوں نے کوئی بے بلانا شروع کر دیئے۔ پہلے

”ابے۔۔۔ اجعے۔۔۔ یہ کیا کر رہا ہے۔۔۔“ سائبان کے نیچے سے لگی نئے لکڑاں

”بھائی کے سامنے دم ہلا رہا ہوں۔۔۔“ ان صاحب نے آنکھوں سے حمید کی طرق اشیا۔ انہوں نے اُسے ہٹانے کی کوشش کی لیکن جب کامیاب نہ ہوئے تو اس پر کوڑے بر سانے

کر کے کھا۔۔۔ مگر وہ درخت سے لپٹا ہی رہا اور پھر کچھ دیر بعد یہو ش ہو کر گر پڑا۔ ڈپنسری سے

وہ دوسرا آدمی بھی بجوتے پر چڑھ آیا۔ اس کے چہرے پر بھی ڈاڑھی اپر اڑھی تھی۔

”اڑھا جو اور اسے اس پفال کر ملینوں کے وارڈ میں پہنچا دیا گیا۔ حمید کے ساتھی خاموشی سے  
آنکھوں میں بلا کی سنجیدگی تھی۔

”وہ دوسرا آدمی بھی بجوتے پر چڑھ آیا۔ اس کے چہرے پر بھی ڈاڑھی اپر اڑھی تھی۔“

”اس کے لاشور میں بچپن ہی سے ظالمانہ رحمات پر درش پاتے رہے ہیں۔۔۔“

”جید یو کھلا کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔۔۔ یہ پچاس بچپن سال کا ایک قوی الجثہ آدمی تھا۔۔۔ چہرے  
پر بھی اور بڑی ڈاڑھی تھی۔۔۔ پیشانی کشادہ اور چمکدار تھی۔۔۔ آنکھیں غنماں اور دھنبدی تھیں ناک  
کے جوڑ پر نظر آنے والا نشان ظاہر کر رہا تھا کہ وہ اب سے پہلے بھی چشمہ لگاتا رہا ہو گا۔۔۔“

ڈسٹرکٹ محسریت پلٹ پار

حمدید نے سینے پر ہاتھ مار اور اسے آنکھ مار کر مسکرا نے لگا۔

”مری جان۔۔۔ اب ترجم کرو، عاشق دلگیر پر۔“

پتہ نہیں ڈسٹرکٹ محسریت کے دل پر کیا گذر رہی تھی۔ البتہ اس کے ڈائیور نے پھر ہر حال ڈاکٹر نے جوڑ  
کر حمید کی گردن پکڑ لی اور حمید اس سے لپٹ پڑا۔

اس طرح اُسے پاگل خانے پہنچنے کا موقع نصیب ہو گیا۔

پاگل خانے کے چھانک کے قریب ہی اندر کی جانب ڈپنسری تھی جس کے آگے نہیں

کا سائبان پڑا ہوا تھا۔ حمید نے بے شمار آدمی دیکھے جو انتہائی سنجیدگی سے کسی نہ کسی کام میں مشغول

تھے۔ کوئی پھولوں کی کیاریوں میں پانی دے رہا تھا۔ کوئی ہندی کی باڑھ کتر رہا تھا۔ کوئی ری بٹ

تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ پاگل تو کسی طرح نہیں ہو سکتے۔

اُسے ڈپنسری والے سائبان کے نیچے ایک قائم پر بٹھا دیا گیا۔ اچانک ایک صاحب جو کافی بے صرف تھا۔

تو نگے تھے اُس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گئے۔ حمید کا دل دھڑ کے لائیں ساتھ دیا وہ یہ بھی سوئے۔

”کوئی خود بھی تو پاگل ہے۔ اگر کسی سے ہاتھا پائی کی نوبت آگئی تو اسے تکلیف سے کرنا پڑے گی۔“

وہ صاحب تھوڑی دیر تک حمید کو گھورتے رہے پھر انہوں نے کوئی بے بلانا شروع کر دیئے۔

”ابے۔۔۔ اجعے۔۔۔ یہ کیا کر رہا ہے۔۔۔“ سائبان کے نیچے سے لگی نئے لکڑاں

”بھائی کے سامنے دم ہلا رہا ہوں۔۔۔“ ان صاحب نے آنکھوں سے حمید کی طرق اشیا۔

”کوئی دھست تیری کی کی....!“

”لاشورو جیوانی جلوں کا گوارہ ہے۔“ اس نے ایک پاگل کو خاطب کر کے کہا۔ ”سنریج“ پاگل نے نفی میں سر ہلا دیا اور پہلے پاگل نے کہا۔ ”ایک قسم کا منطقی شور بھجو لو۔“ بھی کہ سکتے ہو۔ منطقی شور دراصل جلوں کے لئے ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ یہاں مختلف قسم کی عمارتیں تھیں۔ بعض عمارتوں میں اسے کیا سمجھو گے۔ خیر اسے یوں سمجھو میں اس وقت ناچنا چاہتا ہوں لیکن مجھے نہ ناچنے پڑے۔ یہاں کوئی ہرگز ناچنا چاہئے۔ ایک بہت بڑا مین کا شدید بھی تھا۔ جس کے نیچے بے شمار پلٹک تھے منطقی شور کہتا ہے کہ تم یونیورسٹی کے پروفیسر ہو۔ تمہیں ہرگز ناچنا چاہئے۔۔۔ لیکن میر پر نمبر پڑے ہوئے تھے۔“ شروع کر دیتا ہوں۔“

اس نے پیچھے گاگا کرنا پڑا شروع کر دیا۔  
جید سوچ رہا تھا کہ اسے بھی پاگل پن کی کوئی نہ کوئی حرکت ضرور کرنی چاہئے لیکن پھر انہوں کے کوڑے کا خیال کر کے اس کی روح لرگی۔

انہوں کے کوڑے کا خیال کر کے اس کی روح لرگی۔  
دنخاتے سے قریب ہی کہیں بھیں کے ڈکرانے کی آواز سنائی دی اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک دنخاتے سے پیچھے رگڑ کر بھینوں کی سی آوازیں ہنکال رہا تھا۔ جید چوک پڑا۔  
میں نیم کے درخت سے پیچھے رگڑ کر بھینوں کی سی آوازیں ہنکال رہا تھا۔  
”شراپ۔“ ایک محافظ کا کوڑا اس کی پیچھے پڑا اور وہ تملکا کر دو ہوا ہو گیا۔ جب محافظ، بعد ہی تھا۔ جید نے فریدی کے فاکل میں گھنٹوں اس کی تصویر دیکھ کر اس کے خدو خال کوڑا ہیں۔  
تو اس نے گھنٹوں میں منہ دیکھ بھوک کی طرح پھوٹ پھوٹ کر دیا۔ شروع کر دیا۔  
میں کرنے کی کوشش کی تھی۔

جید سوچ رہا تھا کہ یہ پاگل بھی غیر شوری طور پر جابر قتوں سے خاف رہتے ہیں وہ۔ جیسے ہی جید اس کے قریب پہنچا اس نے جھپٹ کر اس کے سینے میں سر اڑا دیا اور پیچھے کی محافظ بس اس کے ایک ہی تھپڑ کافی ہوتا۔ وہ حقیقت کوئی پڑھا لکھا آدمی معلوم ہوتا تھا کہ۔ اُرف رینے لگا۔ جید نے قدم جمادیے تھے۔ اس نے اس کا سر اپنے بازوؤں میں جکڑ کر آہستہ سے نہیں کہ اس کا پروفیسر والا حوالہ درست ہی رہا ہو۔

تو ہوڑی تھوڑی دیر بعد مختلف حصوں سے شور امتحا پھر ”شراپ شراپ“ کی آوازیں۔ ساجد ترپ کر اس کے بازوؤں سے نکل گیا۔ وہ اُسے جیرت اور خوف کے مطابق انداز اور سکوت طاری ہو جاتا۔  
یہ ”بیٹے۔۔۔ بیٹے ساجد۔۔۔ تم پاگل نہیں ہو۔“

شام ہو گئی لیکن وہنہ ملا جس کی جید کو علاش تھی۔ پانچ کے گھنٹے کے ساتھ ہی کام روکو۔ کرفل کی اڑنے والی رائفل نے وزیر خزانہ کا خون کر دیا۔ جید نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے تھا۔ لیکن اب بھی بعض ایسے تھے جو کام ہی سے چھٹے رہنا چاہتے تھے اور انہیں کام سے الگ کر دے کہا۔ ”نادرہ! بھی تک غائب ہے۔ اب تمہیں بولنا ہی پڑے گا اور اگر نہیں بولو گے تو بہت کئی بھی محافظ کو کوڑے پھٹکانے پڑتے اور پھر جب وہ سب اپنی بارکوں کی طرف لوٹ۔۔۔ فتح طریقے اختیار کئے جائیں گے۔“

”تم کون ہو۔“ ساجد خوفزدہ آواز میں بولا۔  
”کل تک میرا گونسلہ مکمل ہو جائے گا اور پھر میں اُن کراس میں جا چھپوں گا۔۔۔ اٹھے۔“

”میں کوئی بھی ہوں۔ لیکن تمہیں بولنا ہی پڑے گا۔“  
”میں کچھ نہیں۔۔۔ نج۔۔۔ جانتا۔۔۔ میں پاگل۔۔۔!“

”تو نہ پاگل!۔۔۔ پاگل تو میں بھی ہوں۔“ جید مسکرا کر بولا۔ ”میں جانتا ہوں کہ یہاں

میڈیکل شٹ قاعدے سے ہوتا ہی نہیں۔ محض پچھلی ہسٹری دیکھ کر پاگل پن کی قسم کا تجزیہ کر کے نمبر لگادیے جاتے ہیں۔ چلو بیٹھ اگلو جلدی اس قسم کی حرaxonی ہر ملکے میں ہو رہی ہے۔

”میرا... شائد... میرا وقت بھی قریب آگیا ہے۔“ ساجد آہستہ سے بڑا بڑا۔

”تو کیا تم نے ہی کرتی کو قتل کیا تھا۔“

”نہیں! ہرگز نہیں۔“

”پھر تمہاری موت کیوں قریب آگئی ہے۔“

”مار ڈالو... مار ڈالو... لیکن مار ڈالنے سے پہلے کسی بیکی طرح مجھے چوہا بکھر کر کیا ملت۔“ ساجد نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔

”جب تم مجرم نہیں ہو تو تمہیں کس بات کا ذرہ ہے۔“ حمید نے پوچھا۔

”بہلاڈ نہیں مجھے۔“ ساجد کا گفتگو ہوا بولا۔ ”مارنا ہے تو مار ہی ڈالو... اب تو تمہیں یہ معلوم ہو گیا کہ میں پاگل نہیں ہوں۔“

”حید اس کے ایک ایک لفظ پر غور کر رہا تھا۔ اس طرح اچانک جھپٹ بیٹھنے کا اس پر جو رد ہوا تھا وہ بھی اس کے پیش نظر تھا۔“

”تم خواہ مخواہ ڈر ہے ہو۔“ حمید اسکے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا اور وہ چیخ کر پیچھے ہٹ گیا۔

”میرا تعلق ملکہ سراغِ رسانی سے ہے۔“ حمید پھر بولا۔

ساجد کسی خوفزدہ شکاری کی طرح دبک رہا تھا۔

”اگر تم یہ چاہتے ہو کہ تمہیں بیہاں سے نکال کر پولیس والوں کے سپرد کر دیا جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

”نہیں... نہیں!“ ساجد مضطربانہ انداز میں بولا اور تھوڑی دیر تک اسے غور سے دیتے کے بعد کہنے لگا۔

”وتم مسٹر کیو کے آدمیوں میں سے نہیں ہو۔“

”مسٹر کیو؟“ حمید حیرت سے بولا۔ ”یہ کون بلا ہے۔“

”مجھے بچاؤ۔“ ساجد بچوں کی طرح سکیاں لیتا ہوا بولا۔

”ڈرو نہیں!“ حمید زرم لجھے میں بولا۔ ”یہ مسٹر کیو کون ہے۔“

”میں نہیں جانتا۔“

”تم نے پھر وہی ضد شروع کر دی۔“

”خدا کی قسم میں نہیں جانتا۔ میرا خیال ہے کہ شاید ہی کسی کو اس کے متعلق کچھ معلوم ہو۔  
بہر حال مجرموں کا ایک جم غیر اس کا تابع فرمان ہے۔“

”اور تم بھی انہیں میں سے ایک ہو۔“

”مم... میں۔“ وہ ہکلا کر رہ گیا۔

”غیر اور نہیں۔ تم سرکاری گواہ بنا کر چھوڑ دیے جاؤ گے۔“

”میں بھیں بہتر ہوں۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”شاید مسٹر کیو مجھے بیجع عدالت میں بھی زندگی چھوڑتے۔“

”اوہ...! تو کیا وہ ایسا ہی خطرناک آدمی ہے۔“

ساجد صرف سر ہلا کر رہ گیا۔ اس کے چہرے پر ہوا یاں اڑ رہی تھیں۔

”وہ ہزاروں آدمیوں کا شہنشاہ ہے۔“ ساجد تھوڑی دیر بعد بولا۔ لیکن ان میں سے شاید ہی کسی کو معلوم ہو کہ ایک کا دوسرا سے کیا تعلق ہے۔“

”ہوں۔“ حمید نر ہلا کر بولا۔ ”میں سمجھ گیا! تم کس طرح اس کے چکر میں پھنسنے تھے۔“

ساجد نے فور اپنی جواب نہیں دیا۔ اس کے چہرے سے پچاہت ظاہر ہو رہی تھی۔

”میں دراصل! مجھ سے ایک بار ایک جرم سرزد ہو گیا تھا جس کے متعلق میں یہ سمجھتا تھا کہ اس پر بیمیشہ پر ڈار ہے گا۔“

”چلو میں تم سے اس کے متعلق کچھ نہیں پوچھوں گا۔“ حمید جلدی سے بولا۔

”لیکن...!“ ساجد بولتا رہا۔ ”مسٹر کیو کو اس کا علم تھا۔ اس نے مجھے بلیک میں کیا۔ مجھے اس کی طرف سے ایک خط ملا۔ جس میں اُس جرم کی تفصیل درج تھی اور مجھے دھمکی دی گئی تھی کہ اگر میں نے مسٹر کیو کی ہر خواہش کے آگے گرنے جھکا دیا تو اس کی اطلاع پولیس کو دے دی جائے گی۔“

”تو تم نے اسے کس طرح مطلع کیا تھا کہ تمہیں منظور ہے۔“ حمید نے پوچھا۔

”ٹیلی فون کے ذریعے! اس نے مجھے نمبر لکھا تھا۔... کہ اگر مجھے منظور ہو تو اس نمبر پر فون کر دوں۔“

”نمبریا دھے؟“ حمید نے کہا۔

”ہاں.... تھری زیرد۔“

”تھری زیرد!“ حمید جرأت سے بولا۔ ”یہ تو میلی فون ایکچھی کا نمبر ہے۔“

”میں جانتا ہوں.... لیکن نمبر یہی تھا۔“ ساجد بولا۔

”پھر....؟“

”پھر اس نے مجھے دوسرے خط کے ذریعہ کر قتل فرید کے بیہان سیکریٹری کی جگہ حام کرنے کی کوشش کا حکم دیا۔“

”اسی رائقل کے لئے۔“ حمید نے پوچھا۔

”ہاں.... لیکن کر قتل فرید بہت چالاک آدمی تھا۔ اس نے مجھے اس کی ہوا بھی نہ لگنے دی، دوسری جرأت انگیز بات یہ کہ کر قتل فرید بھی مسٹر کیو کے گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے قتل سے تین چار دن قبل مجھے اس کا علم ہوا تھا۔ اتفاق سے میرے ہاتھ وہ تین ایسے خوط لگ گئے؛ مسٹر کیونے اسے لکھے تھے۔ بہر حال مسٹر کیو کو بھی اس پر اعتماد نہیں تھا اس نے مجھے اس کے بچے کو شش کی اور کامیاب ہو گیا۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں مسٹر کیو ہی نے کوئی اور طریقہ اختیار کیا ہو۔“ میں کہا گیا تھا کہ میں رات کر قتل فرید کے گھر پر نہ رہوں۔ مسٹر کیو کا وجود مجھے عرصہ سے الجھ میں ڈالے ہوئے تھا۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ میں اس کا سراغ لگاؤں۔ چنانچہ میں نے اس سے حکم کی تعییں نہ کی اور یہ دیکھنے کے لئے کہ اس نے یہ حکم کیوں دیا ہے میں کر قتل کے مکان ہی میں چھپا رہا اور تقریباً بارہ بجے رات کو کسی نے بیچھے سے میرے سر پر کوئی دزنجی چیز ماری اور میں بیٹھ ہو گیا۔ دوسری صبح میں نے خود کو ایک کمرے میں مقفل پایا اور باہر پولیس والوں کے بھاری بھر جو توں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ان میں سے کچھ قتل کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ میں نبڑی طرح گھبرا گیا۔ پولیس والوں سے زیادہ مسٹر کیو کا خوف دیکھیر تھا۔ لہذا فوری طور پر اس سے علاوہ اور کچھ نہ سوچا کہ پاگل بن جاؤں۔“

ساجد خاموش ہو گیا۔ حمید بھی کچھ سوچ رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر بعد بولا۔

”آخر وہ لوگ اس کی بہن کو کیوں لے گئے؟“

”وہ اس رائقل کے متعلق سب کچھ جانتی تھی۔ شائد استعمال کا طریقہ بھی اسے ملتا۔“

”خدا۔“ ساجد نے کہا۔

”کیا وہ لڑکی بہت کم خن تھی۔“

”بہت زیادہ۔“ ساجد نے کہا۔

”اس کی چال کیسی تھی؟“

”چال ہی تو سب کچھ تھی۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسی چال نہیں دیکھی ایسا معلوم ہوتا ہے۔“

”جیسے وہ زمین سے کچھ اوپر تیر رہی ہو۔“

”مسٹر کیو! اس کے ساتھیوں کے متعلق اور بھی کچھ جانتے ہو۔“

”کچھ بھی نہیں! بتایا کہ میں تقریباً چھ ماہ تک کر قتل کے ساتھ رہا لیکن مجھے یہ نہ معلوم ہوا کہ

کہ وہ بھی مسٹر کیو ہی کے گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔ شاید اسے بھی میرے متعلق علم نہ رہا ہو۔“

”لیکن تمہیں اس کے ساتھ ملازمت کس طرح مل گئی۔“

”مسٹر کیو کے خوف نے دلائی تھی وہ ملازمت۔ ظاہر ہے کہ اگر میں وہ ملازمت حاصل نہ

کر سکتا تو میرا بھائی اپھوٹ جاتا۔ جس کی دھمکی مسٹر کیو پہلے ہی دے چکا تھا۔ لہذا میں نے سر توڑ

کو شش کی اور کامیاب ہو گیا۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں مسٹر کیو ہی نے کوئی اور طریقہ اختیار کیا ہو۔“

”لیکن اتم کہہ چکے ہو کہ کر قتل نے تم پر رائقل کا راز کبھی نہ ظاہر ہونے دیا۔ اس کا تو یہ

مطلوب ہوا کہ وہ تمہاری حقیقت سے واقف تھا۔“

”مجھے یقین ہے کہ وہ قطعی واقف نہیں تھا۔“ ساجد بولا۔

”بہر حال اُس رائقل نے ایک بہت بڑے آدمی کی جان لے لی۔ خراب تم کیا کہتے ہو۔“

”یہیں زہنا چاہتے ہو یا کوئی اور انتظام کیا جائے۔“

”نہیں میں یہیں بہتر ہوں۔“ اس نے کہا اور ایک طرف چلا گیا۔ حمید دیر تک کھڑا

اندھیرے میں گھورتا رہا۔

## رنگ اور بھنگ

دوسری صبح سر جنٹ حمید بہت مضھل تھا۔ پاگلوں کے خوف سے اُسے رات بھر ٹھیک سے

نیند نہیں آئی تھی اور دیے بھی سوتا ہی کہا۔ اس کیلئے خاص طور پر کوئی انتظام نہیں کیا گیا۔ پورے پاگل خانے میں بد نظری ہی بد نظری نظر آتی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا یہاں کے عملہ دماغوں میں بھی فور ہے۔ اُسے رات بھر ایک درخت کے تنے سے بیک لگائے بیٹھا رہا پڑا تھا۔ صبح ہوتے ہی وہ پاگل پھر بار کوں اور سائیں انوں سے جانوروں کی طرح ہاٹ دیئے گئے اور انہی مشینیں پھر چل پڑیں۔ ان کی آنکھیں ویران تھیں اور چہرے ہر قسم کے جذبات سے بُرے عاری۔ صرف ان کے جسم حرکت کر رہے تھے۔ جب بھی ان میں سے کسی کے ذہن کی رو بیکتی ہے اس پر کوڑے برستے لگتے اور جب وہ درد سے بے تاب ہو کر چیختا ہے بھی اس کے چہرے پر تکلیف کے احساس کے آثار نہ ہوتے۔ آنکھیں بدستور ویران اور کھوئی کھوئی ہوتیں۔ اس یہ معلوم ہے جیسے یہ آواز کسی مشین ہی سے نکلی ہو۔

حید پھر اپنے پچھلے ہی دن والے کام میں آگا۔ بھوک کے مارے براحال تھا۔ پچھلی رات بھی اُسے بھوکا ہی رہنا پڑا تھا۔ کیونکہ ابھی ہوئی پتل اور بدبوار دال باہر ہے کی سخت روٹیوں ساتھ ہلنے سے نہ اتردی گئی تھی۔ بہر حال اب اُسے خوف تھا کہ کہیں اس بھوک کی حالت میں مخافتوں کے کوڑے نہ کھانے پڑیں۔ آج اسے ان لوگوں میں ساجد بھی دلکھائی دیا جو ایک یعنی درخت کے نیچے چٹائی بن رہا تھا۔ اس کے چہرے پر الجھن کے آثار تھے اور آنکھوں سے خوف جھانک رہا تھا وہ تقریباً دو گھنٹے سے سر جھکائے بیٹھا چٹائیاں بن رہا تھا۔ وہ بھی کبھی کبھی کسی خوفزدہ گید کی طرح سر اٹھا کر اپنی پشت کی طرف دیکھنے لگتا اس کے قریب ہی کچھ اور بھی تھے۔ وہ بھی اس ر طرح خاموشی سے اپنے کاموں میں مصروف نظر آ رہے تھے۔

دفعتاً حید نے ایک چیخ سنی اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ساجد اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک پاگل پر ٹوٹ پڑا۔ قل اس کے کہ مخافتوں کی طرف دوڑتے اس کا سر کئی بار شم کے تنے سے ٹکرایا۔ ساتھ ہی اس کے منہ سے کسی بگڑے ہوئے کتے کی سی غرابہ بھی نکل رہی تھی۔ دو مخافتوں بھی بُری طرح بھٹکوڑا۔ کئی مخافتوں نے اسے رسیوں سے جکڑ کر ان بار کوں ز طرف روانہ کر دیا جہاں خطرناک قسم کے پاگل رکھے جاتے تھے۔

حید سوچ رہا تھا کہ کیا وہ اب چیخ پاگل ہو گیا ہے۔ یا پھر یہ مخافتوں سے محفوظ رہنے لئے دوسرا حکمت عملی تھی۔ ظاہر ہے کہ اب اسے ایک الگ کمرے میں بند کر دیا جائے گا اور

وت تک باہر نہ نکلا جائے گا جب تک ڈاکٹروں کو یقین نہ ہو جائے کہ وہ اب کسی پر حملہ نہیں کرے گا۔

ہنگامہ فرو ہونے کے ایک گھنٹے بعد ایک محافظ حید کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ نیچے جھک کر شلوک کی پشت پر پڑے ہوئے نمبر دیکھئے اور حید سے اٹھنے کو کہا۔  
”پپ... پیاواں۔“ حید اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

”چل بے۔“ اُس نے حید کی گردن پکڑ کر دھکا دیا۔ حید چپ چاپ اس کے ساتھ چلنے لگا۔ ڈپندری کے سامنے کے نیچے ایک آدمی کھڑا ڈاکٹر سے گفتگو کر رہا تھا۔ وہ حید کی طرف دیکھ کر مستکرایا۔ حید سمجھ گیا کہ وہ فریدی کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ سوچنے لگا کہ کمال کا بھیں بدلا ہے ظالم نے.... مسٹر کیا مسٹر کیا کا باپ بھی اسے نہیں پہچان سکتا۔ فریدی نے اس سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ کسی بُرے کسی طرح اسے پاگل خانے سے نکال لائے گا۔ حید نے دل ہی دل میں تقدیمہ لگایا اور سوچنے لگا۔ آج پھنسنے ہو دوست۔ مری جان۔ فریدی صاحب۔ اب کم از کم چار گھنٹے پریشان کئے بغیر نہ ماںوں گا۔

”آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔“ وہ ڈاکٹر صاحب سے درود ناک آواز میں کہہ رہا تھا۔  
”یہ میرا سماں بھائی ہے اور میں اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ بُری مشکل سے ڈاکٹر مجھ سریٹ صاحب اس پر راضی ہوئے ہیں۔“ پھر وہ حید کی طرف ٹڑ کر بڑے پیار سے بولا۔  
”بُو میاں۔“

”بھائی جان۔“ بُو میاں سلمہ جھپٹ کر اُس سے لپٹ گئے اور وہ گھبرا کر چیچھے ہٹ گیا۔ حید نے دل میں سوچا کہ غصب کا ایکٹر ہے۔ اس گھبراہٹ میں کتنا بے ساختہ پن تھا۔ یہ گھبراہٹ کتنی قدر تھی۔ اگر سماں بھائی بھی پاگل ہو جائے تو لوگ غیر شوری طور پر اس سے خائف ہی رہتے ہیں۔

”ماننا ہوں استاد۔“ حید نے دل میں کہا۔ ”مگر میں تمہیں بُنگ ضرور کروں گا۔“ وہ اپنے ساتھ کپڑے بھی لایا تھا۔ سفید کرتا اور پاچا سہ۔ پاگل خانے کے کپڑے اتر والے گئے پاگل خانے کے باہر ایک کار کھڑی ہوئی تھی۔ حید اچھل کر اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور کار چل پڑی۔ حید اس کی پیٹھ پر رہا تھا پھر پھر کر اسے چکار رہا تھا۔ راستہ خاموشی سے طے ہوتا رہا۔ حید

سونج رہا تھا کہ شاید فریدی اس کی افتاد طبع کی بناء پر خاموش ہے۔ سوچتا ہو گا کہ اگر میں نے بوس میں پہلی کی تو حمید نچائے بغیر نہ چھوڑے گا۔ خیر صاحب دیکھتا ہے کہ یہ خاموشی کتنی دیر تار رہتی ہے۔ حمید سونج رہا تھا کہ وہ ان تکالیف کا گن گن کر بدلتے گا جو اسے پاگل خانے میں اخراج پڑیں تھیں وہ اوگھتا اور سوچتا ہا۔۔۔ ذیروہ دن کی تھکن اور پچھلی رات کی بیداری کے اثرات اس کے ذہن پر حاوی ہوتے گئے اور وہ سیٹ کی پشت سے لگ کر خراۓ لینے لگا۔  
پھر اسی وقت اس کی آنکھ کھلی جب اسے جھبھوڑ کر جگایا گیا۔

کار ایک عالی شان عمارت کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ کار سے از کر ادھر اور ہر دیکھنے لگا۔ پچھے بولنے ہی والا تھا کہ اپنی شرارت والی اسکیم کا خیال آگیا۔

”غورر... غورر... غرچ...“ اس نے حلقت سے آواز نکالی اور اپنی دانت میں فریدی کے ساتھ گھسنے لگا جو اس کا ہاتھ تھاے اندر کھینچ لئے جا رہا تھا۔

متعدد راہداری کے چکر کاٹنے کے بعد وہ ایک بڑے کمرے میں پہنچا اور پھر حمید کی روح تیج فنا ہو گئی۔ کمرے کے وسط میں وہی جبشی طالوت کھڑا تھا۔ جسے اس نے اپنی الف بیلی والی رات وہ ڈاکٹر نارنگ کے بنگل میں دیکھا تھا۔ اس کا مر چکرانے لگا لیکن... وہ سونج رہا تھا کتنی زبردست غلطی ہوئی اب اسے سچی فریدی پر غصہ آنے لگا تھا۔ اگر اس نے یقین طور پر کوئی ڈھنگ کی بات بتا دی ہوتی تو وہ مجرموں کے ہاتھ میں کیوں پڑتا۔۔۔ مگر... خیر... اس نے شروع ہی سے کوئی اسکی بات نہیں کی تھی جس کی بناء پر اسے پاگل نہ سمجھا جاتا۔ اس نے مذاق ہی مذاق میں اب تک اپنیا گل پن برقرار رکھا تھا اور یہاں سے نکل بھاگنے کا بس ایک بھی حرہ بہ رہ گیا تھا۔ حمید اپنے دل و دماغ کو متوقع اور غیر متوقع ہر قسم کے حادثات کا مقابلہ کرنے کے لئے قوت ارادی کے تحت منظم کرنے لگا۔ حمید کے ساتھی نے اسے طالوت کی طرف دھکیل دیا۔ طالوت اپنے بے چوڑے بازو پھیلائے آگے کی طرف جھکا ہوا تھا۔ حمید نے اس کے جسم سے ٹکراتے ہی گردن میں ہاتھ ڈال کر دو عدد بو سے اس کے رخادرول پر رسید کر دیے۔

طالوت کی گرفت ڈھکلی پڑ گئی اور وہ اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ حمید چاروں خانے چت زمین؛ گرا۔ طالوت جرت سے آنکھیں پھاڑاے حمید کو گھور رہا تھا۔ حمید پھر اٹھ کر اس کی طرف جھپٹا۔ طالوت نے اپنے دونوں ہاتھ آگے طرف تان دیے۔ جبشی براقد آور تھا۔ حمید شاید اس سے

کندھوں سے بھی بیچارا ہا۔ طالوت اسے ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا اور حمید اس لئے بار بار اچھل رہا تھا کہ شاید دوچار بوسے اور نصیب ہو جائیں۔ ویسے اسکے منہ کی بدبو سے اس کا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ وہ شخص جو حمید کو اپنے ساتھ لایا تھا بے تھاش قہقہے لگا رہا تھا۔ پھر اچاک وہ سنجیدہ ہو کر انگریزی میں غریا۔ ”یہ بنا ہو پاگل ہے۔ تمہیں اسے راہ راست پر لانا ہے۔“  
”نبیں.... نبیں....!“ جبشی غالط سلطان انگریزی میں چیخ۔ ”یہ سچا گل ہے۔“  
”بکو نہیں! اسے ٹھیک کرو۔“

”کیوں.... تم جھوٹے پاگل ہو۔“ جبشی نے کھیا نے انداز میں پوچھا۔  
”بھوں.... بھوں۔“ حمید کے کی طرح بھوکھنے لگا۔ جبشی کا منہ چوم لینے کی کوشش ابھی تک جاری تھی۔

”تیا کے بچ۔“ جبشی نے نہیں کر اس کی گردن دبوچی اور حمید چوٹ کھائے ہوئے کتے کی طرح ”چیاوس چیاوس“ کرنے لگا۔ طالوت پر بھی کا دورہ پڑ گیا۔ وہ حمید کو چھوڑ چھاڑ کر الگ ہٹ گیا۔ کبھی پیسٹ دباتا اور کبھی منہ۔

”خاموش خاموش۔“ دوسر آدمی حلقت پھاڑ کر چیخ۔

طالوت کی بھی رکنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ حمید اب دوسرے آدمی کی طرف جھپٹا۔ پہلے تو اس کے چہرے پر سرا سیمگی کے آثار نظر آئے۔ لیکن دوسرے لمحے میں سنجھل کر اس نے جو ایک ہاتھ جھاڑا ہے تو میاں حمید کو دن میں تارے نظر آگئے۔ وہ اس کے لئے تیار نہیں تھا لہذا تو اوزن برقرار رکھ کر سکنے کی بناء پر ڈھیر ہو گیا۔ لیکن وہ بھی طے کر پکا تھا کہ چاہے جان چلی جائے نکلت نہیں تسلیم کروں گا۔ وہ جھپٹ کر پھر اٹھا اور سبھی حرکت دہرا دی۔

جبشی پیسٹ دباتے پورے کمرے میں ناچتا پھر رہا تھا۔ حمید کی اس حرکت نے تو اسے بے دم کر دیا۔

”میا ہڑا ہے۔“ دوسرے کمرے میں ایک تیز قسم کی نسوانی چیخ سنائی دی اور ایک لڑکی اندر گھس آئی۔ لیکن اب حمید اپنے چہرے پر تھجھ کے آٹا پیدا کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ حمید سے نظر انداز کر کے طرح طرح کی حرکتیں کرتا ہوا جبشی ہی کے پیچھے دوڑ تارہ۔  
”طالوت۔“ دوسرے آدمی نے اسے پھر لالکارا؟ ”خاموش رہو! اور نہ گولی مار دوں گا۔“

اچاک وہ سہم کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ دراصل اب اس میں بہنے کی سکتی نہ رہ گئی تھی۔

نے سوچا کہ اب تھوڑی سی خدمت اس لڑکی بھی کرنی چاہئے۔

اس نے ذرماں انداز میں اپنے دونوں ہاتھ جوڑے اور قدیم ہندوستانی رقص کا ایک پورا۔

ہوا لڑکی کے سامنے جھک گیا۔ پھر اس کے بعد سچک کے بول بولتا ہوا جو ناچا ہے تو ایک ساتھ کل، بھارتیہ نائیم اور منی پور کے دہ دہ پینترے دکھائے ہیں کہ جب شی پر تو گیا ملک الموت ہی سے ہو گیا۔ لڑکی بھی ہنس رہی تھی اور وہ دوسرا آدمی بھی ہستا تھا اور کبھی جھنجھلا کر پیر پیٹھنے لگتا۔

”یہ پاگل نہیں ہے..... ہرگز نہیں ہے۔“ وہ حلق کے بل چیخا اور حمید کا گریبان پکڑ لیا۔

پاگل نہیں ہو۔ میں تمہاری کھال اڑا دوں گا۔“

حید نے دانت نکال کر قبھر لگایا جو اتنا بیانی قسم کا تھا کہ لڑکی خوفزدہ آواز میں جیخ پڑی۔

دفعنا قریب ہی کسی کمرے میں فائز کی آواز سنائی دی اور ساتھ ہی شیشوں کے ٹوٹ کر گرے سے چھٹا کے بھی پیدا ہوئے۔ کمرے میں مناثا پھا گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں حید نے پر

قبھر لگایا۔ وہ سمجھا شاید پوپس آگئی۔

”اے دکھو۔“ دوسرے آدمی نے جب شی سے کہا اور لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے نکل آی۔

راہداری میں رک کر وہ دونوں شاید اندازہ لگانے لگے کہ آواز کس کمرے سے آئی تھی۔ پھر۔

ایک کمرے میں گھس گئے۔ سامنے والی کھڑکی کا ایک شیشہ ٹوٹ کر زمین پر بکھر گیا تھا اور کمر۔

میں بارود کی بوچیلی ہوئی تھی۔ مرد کی نظر سامنے والی میز پر پڑی جس پر ایک یوتل رکھی تھی۔

جھپٹ کر اس کے قریب آیا۔ یوتل کے نیچے ایک کافنڈا کا مکڑا بابا ہوا تھا جس پر کچھ تحریر تھا وہ اٹھا کر پڑھنے لگا۔

”کیا ہے؟“ لڑکی اس کے قریب پہنچ کر بولی۔

”مشرکیو۔“ اس نے سر گوشی کی۔ لڑکی کھڑکی کی طرف بڑھنے لگی۔ لیکن اس نے اس!

ہاتھ پکڑ لیا۔

”اس کی سزا موت ہے۔“ وہ سکھی ہوئی آواز میں بولا۔ ”مشرکیو کو دیکھنے کی خواہش ہی جرم ہے۔

”ہوں! جیسے میں جانتی نہیں۔“ لڑکی بڑے ناز سے چک کر بولی۔

”نہیں.... تم نہیں.... جان سکتیں۔“ وہ مضطربانہ انداز میں بولا۔

”تم مشرکیو ہو۔“ لڑکی نے سمجھ دی گئی سے کہا۔

مرد نے ایک ڈراؤن اس قبھر لگایا اور لڑکی کا ہاتھ پکڑے ہونے پھر اسی کرے میں آگیا جہا۔

جید کو چھوڑ گیا تھا۔ بوتل جس میں کوئی سیال شے بھری ہوئی تھی اس کے ہاتھ میں تھی۔

یہاں حمید اور جب شی دنوں ہی تھک کر بیٹھ گئے تھے۔

”اے مضبوطی سے پکڑو۔“ اس نے جب شی سے کہا۔ حمید اس کے ہاتھ میں بوتل دیکھ کر پہلے

یورا تھا جب شی نے اس طرح جکڑ لیا تھا کہ ہاتھ پیر بلانا بھی مشکل نظر آنے لگا۔

لڑکی کے سامنے نے بوتل سے عرق نکال کاں کر اس کے منہ پر پھینٹے مارنے شروع کر دیے۔ حمید محسوس کر رہا تھا کہ چہرے پر چکے ہوئے پلاسٹک کے نکڑے اپنی جگہ چھوڑ رہے ہیں۔

اے یقین ہو گیا کہ اب جان پکنی محال ہے۔ بہر حال وہ تن بہ تقدیر ہو بیٹھا۔

ایک ایک کر کے پلاسٹک کے سارے نکڑے نکال لئے گئے اور دفعتا وہ لڑکی جیخ جائی۔

”ارے..... یہ تم ہو! امر و بحث۔“

جب شی اسے چھوڑ کر الگ ہٹ گیا۔ حمید تن کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”ہاں..... میں..... سر جنت حمید؟.... اور اب واپس جا رہا ہوں۔“

حید دروازے کی طرف مڑا لیکن جب شی جھپٹ کر درمیان میں آگیا۔

”اس کا مطلب۔“ حمید لڑکی کے سامنے کی طرف مڑ کر بولا۔

”انسپکٹر فریدی کہاں ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”میں نہیں جانتا لیکن تمہیں پچھتا اپنے گا۔“ حمید اپنا اوپری ہونٹ بھیج کر بولا۔

”پاگل خانے کیوں گئے تھے؟“ اس نے اس بات کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

”تم ہو کون؟“ حمید بگڑ کر بولا۔

مرد نے پھر جب شی کی طرف دیکھا اور اس نے حمید کو پکڑ لیا۔ حمید نے ترپن نہیں کیا تھا۔ وہ

جانتا تھا کہ ہاتھ پیر مارنے کا وہی انجام ہو گا جو کسی دلدل میں پھنسنے ہوئے آدمی کا ہوتا ہے۔ وہ

اچھی طرح اندازہ لگا پکھا تھا کہ وہ جب شی کی قوت کا عشرہ عشرہ بھی نہیں رکھتا۔

”فریدی کہاں ہے۔“ مرد نے آگے بڑھ کر حمید کے منہ پر چھٹر مارا۔

حید حتی الامکان پر سکون رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تم جانتے ہو کہ میں اتنی آسانی سے تمہارے ساتھ کوئی چلا آتیا۔" حمید نے اس سے پوچھا۔  
وہ حیرت سے حمید کی طرف دیکھنے لگا۔ اسے شاید یہ موقع نہیں تھی کہ حمید اتنا پر سکون آئے گا۔

"میں جانتا تھا کہ تم ڈاکٹر ناگر ہو۔"

"پھر...؟"

"میں موقع رہا تھا کہ ممکن ہے اس طرح کنوں سے ایک بار پھر ملاقات ہو جائے۔" بڑے مسکرا کر بولا۔

کنوں اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے خاموش کھڑی تھی۔ حمید کے اس جملے پر اس چھرے پر سرخی پھیل گئی۔

"سنوناگر! یا جو کچھ بھی تمہارا نام ہو۔ میں اس لڑکی کو تم سے چھین لے جاؤں گا۔" حمید پھر کہا۔

"فریدی کہاں ہے۔" ناگر گرج کر بولا۔

"کنوں! میں وہ دلچسپ رات ابھی تک نہیں بھولا۔" حمید نے ناگر کی سمنی ان سمنی کو بڑے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

اسی بار پھر ناگر نے ایک بھرپور ہاتھ حمید کے منہ پر مارا اور حمید تو حقیقتاً اس وقت کمال ہاتھ کر رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوا رہا تھا سے تو یہ اور چوت کا کچھ احساس ہی نہ ہو۔

"میں پھر ہوں میرے دوست...!" اس نے قہقهہ لگایا۔ "مجھے ذریبے کہ کہیں تمہیں اس ہاتھ کی ڈرینگ نہ کرائی پڑے۔"

"میں تمہیں مارڈاں گا۔" ناگر حلق کے بل پیچنے۔

"کوئی نئی بات نہیں۔ ہزاروں بار یہ جملہ سن چکا ہوں اور ہزاروں ہی لاشیں میں نے اب قد میں دیکھی ہیں۔"

"چیز ڈالوں سے۔" ناگر نے جبھی کو مخاطب کیا اور جبھی کی گرفت عجک ہونے لگی۔

حمد کو اپنی بہیاں کڑکڑا تی معلوم ہو رہی تھیں۔ لیکن وہ حتی الامکان کو شش کر رہا تھا کہ جسم ڈھیلانہ ہونے پائے۔ اپنے ذہن کو دور کے احساس سے بچانے کے لئے اس نے:

شروع کر دیا۔

"کنوں! میں تمہیں اس جن کے... قبضے سے نکال لے جاؤں گا... یہ سہ کمپنی کا الجھٹ مل گیا ہے۔"

"شٹ آپ...!" کنوں نے اسے ڈانٹا۔ پھر اپنے ساتھی سے کہنے لگی۔ "اس سے کیا فائدہ۔ تم غصے میں حکم کی تعلیم نہیں کر رہے ہو۔ مارڈاں نے کا حکم تو نہیں۔"

دفتار ایسا معلوم ہوا جیسے ناگر ہوش میں آگیا ہو۔  
"چھوڑ دو۔" اس نے طالوت سے کہا۔

اور حمید ایک صوفی پر جم گیا۔

"ایک سگریٹ پاڑو گے۔" اس نے بڑی لاپرواٹی سے ناگر کو مخاطب کیا۔

"میا یہ پاگل نہیں ہے۔" لڑکی حیرت سے بولی۔  
"نہیں۔" ناگر کے لہجے میں سختی تھی۔

حمدیہ ہنسنے لگا۔ کنوں اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

"میں تمہیں معلوم نہیں کہ تم قتل بھی کئے جا سکتے ہو۔" اس نے آہستہ سے پوچھا۔

"تمہارے لئے میں دس بار قتل ہونا منظور کرلوں گا۔" حمید نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

ناگر کنوں کی طرف بلتا۔ اپنے کمرے میں جاؤ۔" اس کا لہجہ تھکمانہ تھا۔ کنوں کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ حمید نے اس کی آنکھوں میں نفرت کی ہلکی سی جھلک دیکھی لیکن پھر وہ دوسرے ہی لمحے میں مسکرا گئی۔ اس نے ایک اچھتی سی نظر حمید پر ڈالی اور کمرے سے چلی گئی۔

"میں نے تم سے ایک سگریٹ مانگی تھی۔" حمید نے ناگر کو مخاطب کیا۔ ناگر کے چھرے پر شدید قسم کی الجھن کے آثار تھے۔ اس نے جب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر حمید کے سامنے ڈال دیا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے اس سے یہ حرکت بے خیالی میں ہوئی ہو۔

"مگر نہیں ایسی حالت میں سگریٹ پینے سے ممکن ہے مجھے غش ہی آجائے؟" حمید نے بڑا کہا۔

"کیوں؟" ناگر نے چوک کر پوچھا۔

"میں کل رات سے بھوکا ہوں۔" حمید نے کہا۔ "پاگل خاؤں کی غذا ہوش مندوں کے لئے

حمد کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ ترکیب نمبر تیرہ کیا چہر تھی۔ جبکی اُسے گود میں الٹا کر ایک دوسرے کمرے میں لے گیا۔ پھر اسکے دونوں ہاتھ پشت پر جکڑ دیئے گئے اور ناگر نے کوڑا سننگا۔

## چھلانگ لگانے والا

حمد کی آنکھ کھلی تو چاروں طرف اندر ہیرا ہی اندر ہیرا تھا۔ پورے جسم میں کچھ اس قسم کی سوزش تھی جیسے اس کی کھال اتار کر کسی نے اُسے نمک کے ڈھیر میں دبایا ہو۔ پچاس کوڑے تک تو اُس نے گئے تھے۔ لیکن اس کے بعد اسے ہوش نہیں رہ گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اچھا ہی ہوا کہ اُسے فریدی کے پروگرام کا علم نہیں تھا ورنہ ممکن تھا کہ وہ اس اذیت سے بچنے کے لئے سب کچھ بتا ہی دیتا اپنی زندگی میں شاید پہلی بار اس نے اتنی بے بی محسوس کی تھی لیکن پھر بھی یہ یقین کر لینے کی کوئی وجہ نہیں بچھ میں آرہی تھی کہ فریدی اس کی طرف سے غافل ہو گا۔

اچاکب ایک تیر قسم کی روشنی کا بڑا سادھہ اس کی پشت کی طرف اندر ہیرے میں ریگ آیا۔ حمید چوک پڑا۔ لیکن وہ اتنی ہی تیری سے مژہ سکا۔ کیونکہ جسم کو جبکش دینے کا خیال ہی اذیت ناک تھا۔ کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی اور سوچ آن کرنے کی آواز کے ساتھ ہی کمرے میں روشنی پہنچ گئی۔

یہ کنول تھی۔ لیکن وہ پہلے کی طرح تردد تازہ نظر نہیں آرہی تھی۔ حمید نے اسے دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ تھوڑی دیر تک کھڑی اُسے دیکھتی رہی پھر اس کے قریب ہی زمین پر دو زانو بیٹھ گئی۔

حمد نے پھر آنکھیں کھولیں اور تکلیف کی شدت سے اپنا چالا ہونٹ دانتوں میں دبایا۔ ”تم بتا کیوں نہیں دیتے۔“ کنول نے سر گوشی کی۔

”میں نہیں جانتا۔“ حمید نے نجف آواز میں کہا۔ ”اوہ اگر جانتا بھی ہوتا...“ ”یہ لوگ تمہیں مار دالیں گے۔“ کنول کی آواز دردناک تھی۔

قط్ٹی ناموزوں ہے اور پھر میں تو کھانے کی میز سے بعض اوقات مخفی اس لئے اٹھ جاتا ہوں۔ کسی ٹشتری سے کچے مسالے کی بونہ آتی ہو۔“

”تم پاگل خانے کیوں گئے تھے۔“ ناگر نے میساختہ پوچھا۔

”ایک آدمی کی تلاش میں! جس کے متعلق یہ معلوم ہوا کہ وہ بنا ہوا پاگل ہے۔“ حمید نے کہا۔ وہ جانتا تھا کہ کچھ چھپانا بے کار ہے۔ مجرم ان کی ایکیم سے واقع ہو گئے ہیں ورنہ وہ اس وقت یہاں نہ ہوتا۔

”لیکن یہ اطلاع غلط ثابت ہوئی۔“ حمید بولتا رہا۔ ”کیونکہ آج ہی اُس نے ایک دوسرے پاگل کو قریب قریب ختم ہی کر دیا ہے اور اب اُسے خطرناک پاگلوں کی کوٹھری میں بند کر دیا گیا ہے۔“

”تم اُس سے ملے تھے۔“

”نہیں.... اُسے تو میں نے اس وقت پہچانا جب محافظ اُسے زنجروں میں جکڑے ہو۔ کوٹھری کی طرف لے جا رہے تھے۔“

”وہ کون ہے۔“ ناگر نے پوچھا۔

”تم آخر مجھے یہاں لائے کس لئے ہو۔“ حمید نے بات اڑا دی۔ ”اس رات کو مجھے بیوقوف بنانے کا کیا مطلب تھا۔“

”دیکھو دوست....!“ ناگر زم لجھ میں بولا۔ ”بہتر ہی ہے کہ تم فریدی کا پتہ بتا دو۔ ورنہ یہ بڑی خراب جگہ ہے۔“

”اس کا علم یہاں داخل ہوتے ہی ہو گیا تھا۔“ حمید نے کہا۔ ”میں پوچھتا ہوں۔ تم لوگ کون ہو اور کیا چاہتے ہیں۔“

”ہم لوگ بہت بُرے ہیں اور فریدی کا پتہ چاہتے ہیں۔“ ناگر مسکرا کر بولا۔

”اور یہ حقیقت ہے کہ مجھے نہیں معلوم، کوئی نہیں بتا سکتا کہ وہ اس وقت کہاں ہو گا۔“

”یہاں....!“ ناگر چاروں طرف دیکھتا ہوا بولا۔ ”ضد کا نتیجہ موت ہی ہوا کرتی ہے۔“

”میں سمجھتا ہوں کہ تم لوگ آج بھی مذاق ہی کر رہے ہو۔“ حمید نے ایسی سنجیدگی سے جس میں لاپرواہی بھی شامل تھی۔

”اے....!“ ناگر جبکی طرف دیکھ کر چینا۔ ”ترکیب نمبر تیرہ۔“

”کون؟“

”میں تمہارے لئے کپا کروں۔“ کنول کی آواز میں بے چینی اور بے بسی تھی۔  
حید نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور کنول تھیر انداز میں دیکھنے لگی۔

”تم کیا کرو۔“ حید بولا۔ ”وہی کوڑا اٹھا لاؤ... اور تم بھی شروع ہو جاؤ۔“

کنول نے اپنے دانت اتنی سختی سے ٹھیکنے کے جرزوں کا گوشہ ابھر آیا۔ شاید وہ آنسو ور  
کے ایک پیساختہ قسم کے ابال کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ کچھ نہ بولی۔ البتہ اس کی عمر  
آنکھیں حید کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

”تم کل رات سے بھوکے ہو۔“ اس نے بھر سر گوشی کی۔

”ٹھیک یاد آیا۔“ حید مسکرا کر بولا۔ ”کیا تم آج مجھے وہی خواب آور دو انہیں دے سکتیں  
مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے میرے جسم پر دلتے انگاروں سے لکیریں ٹھیکنے دی گئی ہوں۔“  
وہ سچ مجھ روپڑی۔ لیکن اس نے جلد ہی اپنے آنسو پوچھ ڈالے اور خوفزدہ نظرؤں سے  
دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔

کہیں دور بھاری قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی جو رفتہ رفتہ نزدیک آئی گئی اور پھر حشر  
اپنے ہاتھوں پر ایک بڑا سپاہی اٹھائے ہوئے نظر آیا۔ دیکھنے ہی کنول حید سے بلند آواز میں بولی۔

”میں کہتی ہوں تمہیں بتانا ہی پڑے گا ورنہ سکا سکا کرمار ڈالے جاؤ گے۔“

”میں نہیں جانتا۔“ حید نحیف آواز میں بولا۔

جھٹی نے پیالہ کنول کے قریب رکھ دیا۔ چند لمحے غنوار آنکھوں سے حید کی طرف دیکھ  
رہا پھر چلا گیا۔

کنول نے چچے سے حید کے منہ میں دودھ پکانا شروع کیا۔

”میں... تمہیں... اس جن... کے قبضے سے...“ حید رک رک کر بولتا رہا۔ ”ضرور  
رہائی دلاؤں گا۔“

کنول کچھ نہ بولی۔

”مجھے یقین ہے۔“ حید اسے ہاتھ کے اشارے سے روک کر بولا۔ ”اس میں بھی کوئی چا  
لکتی ہے۔“

”میں نہیں سمجھی۔“

”تم مجھ سے ہمدردی جتا کر مجھ سے کچھ معلوم کرنا چاہتی ہو۔“

کنول نے انکار میں سر ہلا دیا۔ وہ منہ سے تو پچھہ نہ بولی لیکن اس کی آنکھیں بہت کچھ کہہ رہی  
تھیں.... اور حید کا دعویٰ تھا کہ مرتے دم تک عورتوں کی آنکھوں کی زبان سمجھتا رہے گا۔

”تم نے اس رات مجھے یہ تو قوف کیوں بنایا تھا۔“ حید نے ٹھوڑی دیر بعد پوچھا۔

”نہیں بتا سکتی.... لیکن.... تم کسی طرح یہاں سے نکل جاتے تو اچھا تھا۔“

”کیوں....؟“

”یونہی۔“

”مسٹر کیوں کا خوف۔“ حید نے کہا اور کنول بے ساختہ اچھل پڑی اور اس کے بعد اس سے جو  
فل سرزد ہوا وہ قطعی اضطراری تھا۔ وہ جھپٹ کر دروازے کی طرف گئی اور ادھر ادھر جھانک کر  
پھر واپس آگئی۔ اس کے چہرے پر ہوانیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ ٹھوک ٹھک کر آہستہ سے بولی۔

”خاموش رہو... تم....!“

”باہر کوئی ہے۔“ حید نے پوچھا۔

اس نے نقی میں سر ہلا دیا اور پھر بیٹھ کر اس کے حقوق میں دودھ پکانے لگی۔

”خدا کے لئے۔“ وہ ٹھوڑی دیر بعد بولی۔ ”یہاں کسی کے سامنے اس کا نام نہ لینا ورنہ اسی  
وقت ختم کر دیئے جاؤ گے۔“

”تم نے اسے دیکھا ہے۔“

”کسی نے نہیں دیکھا۔“

”تم اس کے پھنسنے میں کس طرح پھنسیں۔“

”یہ سب مت پوچھو۔“

”تاگر کون ہے!“

”یہاں سے نکلنے کے لئے کچھ سوچو۔“ وہ جلدی سے بولی۔

”تمہارا نام کنول ہے یا کچھ اور۔“

”یہی ہے! یہی ہے۔“ وہ بے چینی سے بولی۔ ”تم اتنے مطمئن کیوں ہو۔“

لی۔ گوشہ گوشہ چھان لیا گیا لیکن حمید کے علاوہ اور کوئی نہ ملا۔ حمید گھری نیند سو رہا تھا۔ پولیس والوں نے اسے اس کی کوٹھڑی سے نکال کر ڈرانگ روم کے ایک صوفے پر ڈال دیا۔ پھر وہ عمارت کی تلاشی لینے میں مشغول ہو گئے اور انہیں اس کا بھی دھیان نہ رہا کہ وہ حمید کو تھا چھوڑ آئے ہیں۔ کو تو ای انجارچ انپکٹر جلدیں کے ساتھ دو سب انپکٹر تھے اور وہ تمیوں اس کا میابی کے خیال میں مگن تھے کہ ہر قسم کے خدشات سے گویا محظوظ ہی ہو گئے تھے۔

جب وہ تلاشی لے کر پلے تو ان کے پیروں سے زمین نکل گئی۔ ڈرانگ روم خالی اور حمید غائب تھا۔ وہ پھر دیوانوں کی طرح پوری عمارت میں پھیل گئے۔ لیکن لا حاصل حمید کا کہیں پتہ نہیں تھا۔

حمد کو یقین تھا کہ اس کی نیند خود بخود نہیں ٹوٹی کیونکہ آنکھیں کھلتے ہی اسے اپنے منہ میں کسی کڑوی یا کسلی چیز کا مزہ محسوس ہوا اور ایک خاص قسم کی بو بھی اس کے ذہن میں گونج رہی تھی۔ وہ کراہ کراہ بیٹھا۔ بترا بہت ہی نرم اور پر تکلف تھا اور ملائم تکیوں سے ویسی ہی خوبصورتی تھی جیسے وہ اپنے تکیوں کے لئے استعمال کرتا تھا۔ کراہ بھی وہ نہیں تھا جس کے فرش پر چلتے ہیں اس نے کنوں کے ہاتھ سے دودھ پیا تھا۔ اس کی نظریں کھلی ہوئی کھڑکی کے باہر ریگ گئیں۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔۔۔ لیکن یہ کیا؟ چاندنی کی کرنیں زمین پر مچھتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ یہ ایسی تعجب خیز بات تھی کہ وہ اپنی تکالیف کا احساس کئے بغیر اچھل کر کھڑا ہو گیا اور جھپٹ کر کھڑکی کے قریب پہنچا لیکن دوسرا سے بی لمحے میں دل چاپا کہ اپنے منہ پر تھپٹر مارے۔ چاندنی کی کرنیں زمین پر نہیں بلکہ دریا کی لمبی لمبی پر نچل رہی تھیں۔ کھڑکی سے تقریباً سو بارہ فٹ پیچے دریا ہے رہا تھا۔ وہی طرف اسے پل نظر آیا اور پھر وہ کشم ہاؤس کی عمارت کو بھی پیچان گیا شاید وہ اسی عمارت کے کسی کوارٹر میں تھا۔ دفعتاً اسے اپنے پیچھے قدموں کی آواز ستائی دی اور وہ چونکر مرزا دروازے میں ایک آدمی نظر آیا جس کی شکل حمید کے لئے نئی تھی۔

”ڈرو نہیں۔“ وہ مسکرا کر بولا اور حمید اس کی آواز پیچان کراچھل پڑا۔

”یہ فریدی تھا۔“

وہ چند لمحے اسے گھورتا رہا پھر آہستہ سے بولا۔

”آپ کے پاس ریو الور ہو گا؟“

”میں ہر حال میں مطمئن رہتا ہوں۔“ حمید نے مسکرا کر کہا۔

”تب تم بھی جن ہی معلوم ہوتے ہو۔“ کنوں نے پیالے کی طرف اشارہ کیا۔

چوڑوں کی تکلیف معمولی نہیں تھی لیکن حمید کسی طرح بھی یہ نہیں ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ ”خوفزدہ ہے یا اس نے کوڑوں کی اس بارش کو ذرہ برابر بھی اہمیت دی ہے۔“

”تم بہت اچھی ہو۔“ حمید اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتا ہوا پیار بھرے لبھے میں بولا۔

”تم کچھ امر و بخت ہی معلوم ہوتے ہو۔“ کنوں مسکرا پڑی۔ ”کچالو بن گیا ہے تمہارا گھر اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے۔“

”اگر اس وقت منہ میں دودھ نہ ہوتا تو کچالو کے نام پر پانی بھر آیا ہوتا۔“

کنوں صرف مسکرا کر رہا گئی۔ حمید سوچ رہا تھا کہ ساجد کی بات نیک ہی تکلی کسی ”مسٹر کیو“ کا وجود ضرور ہے اور یہ لوگ بھی اس سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کا دل چاہا کہ کرٹل کی بہن نادرہ سے متعلق بھی پوچھے لیکن فوراً خیال آگیا کہ وہ اپنی پاگل خانے والی ناکامی کی داستان تارک کو سنا چکا ہے۔ اس کا ذہن پھر بوجھل ہوتا جا رہا تھا۔ پیالے کا دودھ ختم ہونے سے پہلے ہی اس نے ہاتھ اس کر کنوں کو روک دیا۔ وہ تھوڑی دیر تک بیٹھی اس کو دیکھتی رہی پھر اس کے ہونٹوں پر خفیت تر مسکراہٹ کی جھلک دکھائی دی۔ حمید نے نیند کے دباؤ سے جھکتی ہوئی پلکوں کو زبردستی اٹھا۔

بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”شکریہ! میرے لئے یہی بہتر ہے۔ آج کی خواب آوز دو ازیادہ فائدہ مند ثابت ہو گی۔“

اور پھر وہ سو گیا۔ کنوں تھوڑی دیر تک بیٹھی اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتی رہی اور پھر انٹھ کر چلی گئی۔ وہ راہداری کے موڑ پر پہنچی تھی کہ کسی سے نکل آگئی۔ پیالہ ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا۔

یہ تارک تھا اور بُری طرح بد حواس نظر آ رہا تھا۔

”پولیس...!“ وہ ہاپٹا ہوا بولا۔ ”طالبوت کہاں ہے۔“

”باؤر پی خانے میں۔“

”چلو...!“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر دوڑتا ہوا بولا۔ ”پولیس نے گھیرا اڈاں دیا ہے۔“

باؤر پی خانے سے انہوں نے طالوت کو لیا اور ایک تاریک تاریک راہداری میں گھستے چلے گئے۔

تھوڑی ہی دیر میں پوری عمارت پولیس والوں کے بھاری قدموں کی آواز اسی دے گئی۔

اور کون ہیں؟ اس کا پتہ نہیں۔ میں نے کبھی اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی کہ ان کا پتہ گاؤں۔ وہ بھی بہر حال سرکاری ہی آدمی ہیں۔“

”اور ان کا میلی فون نمبر بھی تھری زیرو ہے۔“ حمید نے پوچھا۔

”ہاں...!“

”اور یہی میلی فون نمبر ایکچھے کا بھی ہے۔“

”ہاں؟ اور شاید یہی چیز تمہیں الجھن میں ڈالے ہوئے ہے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”قطعی...!“

”مسٹر کیو کے لئے میلی فون ایکچھے میں خاص طور سے انتظام کیا گیا ہے۔ مسٹر کیو کے لئے کوئی کال آتے ہی میلی فون آپریٹر اس کا سلسلہ ایک رانسیمیٹر سے ملادیتا ہے۔ اس طرح ایکچھے سے مسٹر کیو کے لئے میلی فونک رائنسشن ہو جاتا ہے اور آپریٹر تک کو اس بات کا پتہ نہیں چلتے پاتا کہ یہ کال کہاں کے لئے آئی تھی۔“

”تو اس کا مطلب ہے کہ سیکرٹ سروس والے ہی...!“

”نہیں حمید صاحب۔“ فریدی مفطر بانہ انداز میں بولا۔ ”اتنی جلدی کوئی فیصلہ صادر کر دینا لیکیں ہے۔ بہت دنوں بعد ایسا کیس ملا ہے جس میں ذہنی اور جسمانی دونوں طرح کی درزشیں کرنا پڑیں گی۔“

”وہ خاموش ہو کر سگار سلاکا نے لگا اور حمید بولا۔

”حمدی صاحب! اگر اپنی کھال میں صحیح سلامت رہے تو؟“

”یار مجھے حقیقتاً ساری زندگی اس کا افسوس رہے گا کہ تم اس حال کو پہنچ گئے۔“ فریدی نے کہا۔

”خیر آپ کا یہ افسوس میری بیٹھ کی سوزش نہیں کم کر سکتا۔“

”مگر یہ تو سوچو کہ کنول نے تمہیں دودھ پلایا ہے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”بھیں کا دودھ پلایا تھا۔“ حمید جلدی سے بولا اور فریدی ہنسنے لگا۔

”سمجھ میں نہیں آتا کہ.... راجن.... ڈاکٹر نارنگ کی دیکھی جائیداد کا مثیر کہاں غائب ہو گیا؟“ اس نے تھوڑی دیر بعد کہا۔

”اوہ....!“ حمید متاسفانہ لمحے میں بولا۔ ”مجھے اس کے متعلق کنول سے پوچھنا چاہئے تھا....“

”ہاں! کیوں؟“ فریدی کے لمحے میں جرت تھی۔

”تھوڑی دیر کے لئے ادھار دے دیجئے۔“

”کیوں؟“

”میرا دل چاہتا ہے کہ آپ کو گولی مار دوں۔“ حمید حلق پھاڑ کر چیخا۔

فریدی اس کے قریب آکر کھڑا ہو گیا اور اس کا شانہ ٹھپکتا ہوا بولا۔

”اگر تم اس وقت مجھے توپ سے بھی اڑا د تو میرا ناون گا! میرے اچھے بیٹے۔“

”ذریا پیٹھ دیکھئے میری۔“

”میں دیکھ چکا ہوں.... اور اس کے لئے ان کا جسم کا ایک ایک ریشہ ادھیر ڈالوں گا۔“

فریدی نے اسے پلٹک پر لادیا۔ تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی ہیں۔ پھر حمید اپنی

داستان بیان کر چلا۔ حالانکہ اس نے سب سے پہلے اسی کے متعلق معلوم کرنا چاہا تھا کہ وہ یہاں

تک کیسے پہنچا۔ لیکن فریدی نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ خود اپنی روادا پہلے نہیں۔ جیسے ہی حمید نے

مسٹر کیو کا نام لیا فریدی تقریباً چھل پڑا۔ وہ تھیر خیز نظروں سے حمید کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”کیا بات ہے؟“ حمید نے پوچھا۔

”کچھ نہیں.... کہتے چلو.... پھر بتاؤ گا۔“

حمید نے بیان جاری رکھا اور جب وہ خاموش ہوا تو فریدی نے پوچھا۔

”وہ لڑکی.... لیعنی نادرہ بھی کہیں نظر آئی تھی۔“

”نہیں.... لیکن مسٹر کیو کے نام پر جو کئے کیوں تھے۔ کیا آپ پہلے سے اس کی شخصیت سے

واقف ہیں۔“

”ہاں.... لیکن اس کی اس حیثیت کے متعلق شاید خواب میں بھی نہ سوچ سکتا۔“ فریدی نے

خیال انداز میں بولا۔

”لیعنی....!“ حمید کے لمحے میں جرت تھی۔

”اس نام کا تعلق سیکرٹ سروس والوں سے ہے۔“

”آپ انہیں جانتے ہیں۔“

”میں صرف ان کی تعداد جانتا ہوں۔ وہ پانچ ہیں اور یہی نام استعمال کرتے ہیں کہاں ہیں۔“

خیر.... اب آپ بتائیے کہ یہ کم بخت شہزادہ امر و بخت.... کچالو خصال بن کر یہاں تک کیسے پہنچا۔ ”حقیقتاً اس حادثے کی تمام تزدہ داری مجھ پر ہی ہے۔“ فریدی نے کہا اور پھر اپنے جو تے اتر کراطمنا سے پیش تھا ہوا بولا۔ ”میں نے تمہارے پاگل خانے پہنچنے والے واقعے کو شہرت دی تھی۔“

”شہرت دی تھی۔“ حمید حیرت اور غصے میں بولا۔

”جس نے شہرت دی تھی اس میں کامیابی بھی ہوئی لیکن ایک جگہ دھوکا کھا گیا۔... خیر.... بہر حال میں نے اس نے اس معاملے کو شہرت دی تھی کہ مجرموں پر اس کا رد عمل دیکھ سکوں۔ میں جانتا تھا کہ وہ تم پر قابو پانے کی کوشش ضرور کریں گے۔ چنانچہ ایک آدمی نے ڈسٹرک محسٹریٹ کا جعلی اجازت نامہ بنایا اور اسے لے کر پاگل خانے پہنچ گیا۔ تم نے پاگل خانے کے تھوڑے فاصلے پر ایک دوسرا کار بھی دیکھی ہو گی۔ جس کے پیچے گراپ واٹر کا اشتہار لگا ہوا تھا وہ میں نے اس کمپنی سے اس مقصد کے لئے حاصل کی تھی۔... بہر حال میں نے اس پر تم دونوں کا تعاقب کیا۔“

فریدی رک کر سگار سلاگانے لگا۔

”اور اس کے باوجود آپ اتنی دیر میں پہنچ۔“ حمید بھتنا کر بولا۔

”سنست تو جاؤ! اس عمارت کے سامنے پہنچ کر میں الجھن میں پڑ گیا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس میں مغربی جرمی کا سفیر رہتا ہے اور وہیں اس کا دفتر بھی ہے۔ تم جانتے ہی ہو کہ ایسے موقع پر جس قسم کی کاروائیاں ہوتی ہیں۔ میں نے نگرانی کیلئے ریشم اور حید کو دہاں کر دیا اور خود ڈی۔ آئی۔ جی۔ کے پاس پہنچا۔ بہر حال دہاں کی تلاشی کا اجازت نامہ حاصل کرنے میں دیر ہو گئی اور پھر جب دہاں گھیرا دالنے کا انتظام کیا جا رہا تھا تو اچاک یہ اطلاع میں کہ عمارت دراصل خالی ہے۔ سفیر کا دفتر کئی دن ہوئے کسی دوسرا عمارت میں منتقل ہو گیا ہے۔ دھوکا دراصل اس نے کھا گیا کہ دہاں سے سفارت خانے کا بورڈ نہیں ہٹالیا گیا تھا یا ممکن ہے کہ خود مجرموں ہی نے دوسرا لگادیا ہو۔ بہر حال باہر تو بورڈ لگا ہوا تھا اور اندر ایک جگہ ایک تھی پر لکھا ہوا ملا۔ کرانے کے لئے خالی ہے، خیر.... بے چارے جلدیں وغیرہ تو یہی سمجھ رہے ہوں گے کہ تم پھر مجرموں کے ہاتھ میں پڑ گئے۔“

”ھوڑی دیر تک خاموش رہی پھر حمید بولا۔

”تو وہ لوگ گرفتار ہو گئے۔“

”کہاں.... کوئی ان کی گرد کو بھی نہ پاس کا۔ البتہ ابھی اطلاع ملی ہے کہ پولیس نے دو تھیں تک جھک مارنے کے بعد ایک پور دروازے کا پتہ لگایا ہے جو ایک پتلی سی گلی میں کھلتا ہے اور جہر کسی نے دھیان تک نہیں دیا تھا۔ یعنی اور ہر پولیس نہیں تھی۔“

اور بھی کام کر رہا ہے یا نہیں۔“ حمید نے پوچھا۔

”میں نے ابھی تک تو اسے بلا یا نہیں۔“ فریدی پر خیال انداز میں بولا۔ ”سب کو ایک ساتھ بہزاد بنا مناسب نہیں سمجھا۔ یہ کیس بڑا چیزیدہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کچھ تازہ دم لوگ بھی موجود رہیں۔ ہو سکتا ہے کہ حالات کوئی دوسرا رخ اختیار کر لیں۔ فی الحال.... میں نے یہ انتظام لایا ہے کہ ملک بھر میں اس وقت تک ماں یکروں استعمال نہ کیا جائے جب تک ایک پرسٹ یا اطمینان نہ کر لیں کہ اس میں کوئی دوسرا سٹم بھی تو نہیں پایا جاتا۔“

”ملک بھر میں....؟“ حمید حیرت سے بولا۔

”جناب.... یہ کوئی ملک گیر تنظیم معلوم ہوتی ہے۔“

کچھ دیر خاموش رہی پھر فریدی بولا۔

”میرا خیال ہے کہ داونوں پسینے آجائے گا۔ کیونکہ اس سٹر کو نے برا بھی طریقہ اختیار کیا ہے۔“

”لیکن آپ تو سیکرٹ پرسوس!....؟“

”ٹھیک ہے۔“ فریدی حمید کی بات کاٹ کر بولا۔ ”یہ نہیں سوچا جا سکتا کہ سیکرٹ سروس اسے اس قسم کی کوئی حرکت کریں گے۔ اس کیس میں یہی تو ایک اہم نکتہ ہے میرا خیال ہے کہ وہ پانچوں سیکرٹ سروس والے دوسرا دنیا میں پہنچ چکے ہیں۔“

”کیوں؟“

”ظاہر ہے کہ ان کی زندگی میں تو یہ ناممکن ہے کہ کوئی ان کا نام استعمال کر سکے۔“ وہ دونوں پھر خاموش ہو گئے۔ فریدی خیالات میں ڈوبا ہوا تھا اور حمید کا ذہن نیزد کے تانے بانے میں الجھتا جا رہا تھا۔ دفعتا وہ فریدی کی آواز سن کر جو نک پڑا اور ساتھ ہی ایسا معلوم ہوا جیسے پیچے دریا میں کوئی وزنی چیز کافی اوچائی سے گری ہو۔ قبل اس کے کہ وہ کچھ سمجھتا فریدی کھڑکی مل پڑھ کر دریا میں چھلانگ لگا چکا تھا۔ حمید پہلے تو اچل کر کھڑکی کے قریب گیا پھر دروازے کی طرف بھاگا۔ آگے ایک چھوٹا سا سچن تھا۔ حمید دروازہ کھول کر مکان کے باہر آخیا۔ باہر سناتا تھا۔

غایب رات آدمی سے زیادہ گز چکی تھی۔ گھٹ بھی بالکل سنا اور پل پر آمد و رفت بھی ہو چکی تھی۔ حمید کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ وہ شاید ایک منت تک بے حس و حرکت کھڑا دریا کی سطح پر نظریں جماں رہا۔ کچھ دوسری بڑی بڑی لہریں گرداب کی شکل میں اٹھ رہی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی سیاہی چیز سطح پر ابھرتی اور ڈوب جاتی۔

حمد کا جسم اور دماغ دونوں ہی تقریباً بیکار تھے۔ یہاں تک وہ محض اضطراری فعل کے تھے پہنچا تھا اور اب اسے ایک منت کھڑا ہوتا بھی دوسرے معلوم ہو رہا تھا۔ صرف ایک سوال اس نے ڈھن میں تھا کہ اسے کیا کرنا چاہتے۔ وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ فریدی نے دریا میں چھلانگ کیوں لگائی تھی۔ وہ وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے محوس کیا کہ کوئی تیرتا ہوا اسی طرف آرہا ہے۔ فریدی نے کنارے پہنچ کر کسی دوسرے آدمی کوپانی سے کھنچ کر باہر نکلا۔

## خوفناک آنکھیں

فریدی اسے کاندھے پر اٹھائے ہوئے گھر کے اندر چلا گیا۔ حمید اس کے پیچھے تھا۔ روٹر میں پہنچتے ہی حمید کی آنکھیں جھرتے سے پھٹی رہ گئیں۔ فریدی نے اسے فرش پر ڈال کر اس پیٹ سے پانی نکالنے کی تدبیریں شروع کر دی تھیں۔

”ہیلو...!“ دفتارہ رک کر بولا۔ پھر مرکر حمید کی طرف دیکھنے لگا۔

”کیا یہ وہی نہیں ہے جو تمہیں پاگل خانے سے لے گیا تھا۔“

”ناگر...!“ حمید آہستہ سے بولا۔

فریدی بدستور مشغول رہا۔ اس نے اس کے گیلے کپڑے اتار کر اسے ایک چادر میں پیٹ دی۔ حمید کھڑکی کے قریب کھڑا باہر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں یہ بھی کوئی چاہ تو نہیں۔ پھر وہ صحن کی طرف جھپٹا اور باہر کے دروازے میں کندی لگا کر واپس آگیا۔ فریدی کو پر بیٹھا ہے ہوش آدمی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی دو اوں کا بکس فرش پر کھلا رکھا تھا اور اس کے اپنے ہاتھ میں انجلشون والی سرخ سنجال رکھی تھی۔

”تم کھڑے کیوں ہو؟“

”ہمیں غالباً نہ رہنا چاہئے۔“ حمید جلدی سے بولا۔ ”کہیں یہ کوئی چال نہ ہو۔“

”جو کچھ بھی ہے ابھی ظاہر ہو جائے گا۔“ فریدی پر سکون لجھ میں بولا۔ ”تم اس آرام کر سی

پلیٹ جاؤ۔۔۔ مگر نہیں تمہاری بیٹھے اس قابل نہیں۔ بہتر تو یہی ہے کہ.... اچھا ذرا ادھر آؤ۔“

پھر وہ اسے برآمدے میں لا کر بولا۔ ”اسے شاید دو تین منت بعد ہوش آجائے۔ جب تک

میں نہ کھوں تم اس کے سامنے مت آتا۔ یہاں اس پنگ پر لیٹ جاؤ۔ بلکہ سو جاؤ تو بہتر ہے۔“

”میا۔۔۔ آپ نے اسے کو دیکھ لیا تھا۔“ حمید نے پوچھا۔

”اس نے پل پر سے چھلانگ لگائی تھی۔“ فریدی بولا۔

”پتے نہیں کیا بات ہے۔“

”ہو سکتا ہے کہ یہ مسٹر کیوں کا کسی قسم کا عتاب ہو۔“ فریدی پکھ سوچتا ہوا بولا۔۔۔ اس نے

برآمدے میں پڑے ہوئے پنگ کی طرف اشارہ کیا اور کمرے میں چلا گیا۔

ناگر کو ہوش آگیا تھا۔ وہ پنگ پر چلتا تھا اور انداز میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ فریدی

پر نظر پڑتے ہی اچھل کر بیٹھ گیا۔ چند لمحے خوف دہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا باہر اس طرح

اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے جیسے دفتار اس کی پیٹائی ہی رخصت ہو گئی ہو۔ وہ نہیں طرح کانپ رہا

تھا۔ ”جھے جہنم میں جھوک دوا میں خود ہی کوڈ جاؤ گا۔۔۔ مگر میرا قصور۔۔۔ مجھے میرا قصور بھی

تو ہے۔۔۔ یا پھر مجھے مر ہی جانے دو۔۔۔ اس طرح اوہیرو موت۔۔۔ ایک چوہے کی طرح بے بس نہ کرو۔“

وہ خاموش ہو گیا پھر دھنٹا حلقت پھڑا کر چینجا۔ ”شام نے۔۔۔“

”سن لیا۔۔۔!“ فریدی آہستہ سے بولا۔

”میں ایسی زندگی پر موت کو ترجیح دیتا ہوں۔“ ناگر نے اپنی آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹاتے

ہوئے کھل۔

لیکن وہ اب بھی فریدی کے چہرے کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔

”اگر تم وعدہ کرو کہ آئندہ کبھی اقدام خود کشی نہ کرو گے تو میں تمہیں پولیس نکلے خواہ نہ کرو۔“ فریدی ایسے کہا۔

ناگر نے ایک لمحے کے لئے فریدی کی طرف دیکھا اور پھر نظریں ہٹالیں۔

”میاں پوچھ سکتا ہوں کہ تم نے خود کشی کی کوشش کیوں کی تھی۔“ فریدی پھر بولا۔  
”میں کچھ نہیں جانتا۔“ ناگر نے سہی ہوئی آواز میں کہا۔

”یعنی تم ارادتا نہیں کر رہے تھے۔“ فریدی اسے پر خیال انداز میں دیکھ رہا تھا۔  
”مجھے جانے دو۔“ ناگر اٹھتا ہوا بولا۔

”جاو...!“ فریدی کے ہونتوں پر ہلکی سی مسکراہٹ دکھائی دی۔ وہ اسے شرات آئی  
نظر والی سے دیکھتا رہا۔ پھر بولا لیکن شاید اس بار کسی روپا اور کی گولی کو تمہارے سینے کا راستہ ٹھاڑ  
کرنا پڑے۔

ناگر اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں وہ پھر پنگ پر گر کر اپنا برہمنہ جسم چاڑ  
سے چھپا نے لگا۔

”ڈرو نہیں!“ فریدی نرم لمحے میں بولا۔ ”تم اب قطعی محفوظ ہو۔ یہاں میری موجودگی میں  
کوئی تم پر ہاتھ بھی نہیں اٹھاسکتا۔ ویسے میں یہ ضرور جانتا چاہوں گا کہ تم دریا میں خود کو دے تھے  
کسی نے تمہیں پھینکا تھا۔“

”میں نہیں جانتا۔“

”پھر وہی ضد...!“

”میں کچھ نہیں جانتا۔ میرے ذہن میں صرف بھی ایک خیال تھا کہ کوڈ جاؤں بس کو دگیا۔  
اور وہ تمہارا اپنا خیال نہیں تھا۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”میا...؟“ ناگر پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”بھی کہ تم خود سے نہیں کوڈے تھے۔“

”تم کون ہو؟“ ناگر خوفزدہ آواز میں بولا۔

”ڈرو نہیں! میں ان میں سے نہیں جھوٹوں نے تمہیں چلاگ لگانے پر مجبور کیا تھا۔“

”پھر آخر کون ہو۔“

” بتاتا ہوں۔“ فریدی نے کہا اور میز پر رکھے ہوئے کپڑے اٹھا کر اسے دیتا ہوا بولا۔ ”انہیں  
چکن لو۔“

ناگر نے تمہیں اور پتلوں پہنچی! لیکن اس کی تحریر آمیز نظریں بار بار فریدی کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔

”آؤ میرے ساتھ۔“ فریدی نے برآمدے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔  
جیسے ہی ناگر کی نظر حید پر پڑی وہ لڑکھڑا گیا۔ اگر فریدی سہارے کئے لئے اپنا بازو آگئے نہ  
کر دیتا تو اس کا سر دیوار سے تکرا گیا تھا۔  
حید بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”اب بتاؤ بیٹے ناگر صاحب۔“ وہ طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔  
ناگر نے آنکھیں بند کر لیں۔

” غالباً... اب تم یہ سمجھ گئے ہو گے کہ میں کون ہوں۔“ فریدی نے کہا۔  
”پولیس...!“ ناگر کا پنچا ہوا بولا۔

”میں یہ بھی جانتا ہوں۔“ فریدی نے حید کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”مگر تم پر یہ ساری  
مصیتیں اس کی وجہ سے نازل ہوئیں تھیں۔“

”کیا...؟ مم... میں نہیں سمجھا۔“ ناگر ہکلایا۔

”تم نے اسے پولیس والوں کیلئے چھوڑ دیا تھا اور خود فرار ہو گئے تھے۔ لہذا تمہارے مسٹر کیو...!“  
ناگر کی ایک بے ساختہ قسم کی جیج نے فریدی کا جملہ نہ پورا ہونے دیا۔

”تم جھوٹے ہو۔“ ناگر نے کپکاپی ہوئی آواز میں کہا اور کمرے میں بھاگ گیا۔  
پھر فریدی اور حید نے بدھواہی کے عالم میں اسے پنگ کے نیچے گھستے دیکھا۔

”لب...!“ حید نے قہقہہ لگایا۔ ”چلو خیر! میں تمہیں سول پولیس کے رحم و کرم پر چھوڑتا  
ہوں۔“ فریدی نے اسے بدقت تمام پنگ کے نیچے سے نکالا۔

”تم... تم... مسٹر کیو کے آدی ہو۔“ ناگر ہنیانی انداز میں بک رہا تھا۔ ”میں کہیں نہیں بچ  
سکتا کسی طرح نہیں بچ سکتا۔“

”تو تمہیں اسی طرح یقین دلایا جا سکتا ہے کہ تمہیں پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔“ فریدی  
نے کہا۔

”جھوٹ... بلف... دھوکا... مسٹر کیو کا نام اسکے آدمیوں کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا۔“  
”لیکن اس کا نام مسٹر کیو تو نہیں ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”ہمیانہ ہو۔ لیکن اس نام سے بھی کوئی واقعہ نہیں ہے۔“

”ایسا تو نہیں۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”اس کے ساتھیوں کے علاوہ دو اور آدمی بھی ہیں جو اس نام سے واقف ہیں۔“

”کون؟“

”انپکٹر فریدی اور سرجنت حمید۔“

”تت... تو... آپ... مسٹر فریدی... ہیں۔“ ناگر کے لجھ میں حیرت تھی۔

فریدی مسکرا تارہا۔ ناگر تھوڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد پھر بولا۔

”تو پھر... خدا کے لئے... مجھے کسی بند گاڑی میں جیل خانے بھجواد بیجئے... ورنہ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا... اور میں نے ابھی تک کوئی ایسا جرم نہیں کیا جس کی سزا موت ہو۔“

”تم یہاں ہر طرح محفوظ رہو گے۔“ فریدی نے کہا۔ ”بشرطیکہ جو کچھ پوچھوں اس کا حق چھوڑو۔“

”میں سب کچھ کروں گا۔ مجھے بچائیے۔“

”تم جانتے ہو کہ مسٹر کیوں حقیقتاً کون ہے؟“

”یہ میں نہیں جانتا۔“

”اے کبھی دیکھا ہے۔“

”نہیں۔“

”اس رات جب تم نے سرجنت حمید کو ڈاکٹر نارنگ کے یہاں بے وقف بیالا تھا تمہارے ساتھ لکھنی لے کیا تھیں۔“

”وو...!“

”جو حمید سے پہلے ملی تھی کون تھی؟“

”یہ میں نہیں جانتا۔ مسٹر کیوں حکم سے میں اسے وہاں لے گیا تھا۔“

”تمہارے پاس وہ کب سے تھی۔“

”اُسی دن آئی تھی۔ جس دن میں وہاں گیا تھا۔“

”وہ کہاں سے آئی تھی۔“

”میں یہ بھی نہیں جانتا۔ مسٹر کیوں حکم کے مطابق میں نڑک کے کنارے کھڑی ہوئی اب تک۔“

بند گاڑی میں بیٹھ گیا تھا۔ وہ لڑکی... جب شی... اور کنوں... تینوں مجھے اس میں ملے تھے۔“

”کنوں کون ہے۔“

”اس نے مجھ سے آج تک نہیں بتایا۔“

”ڈاکٹر نارنگ کے غیر راجن سے تمہاری جان پچان کس طرح ہوئی تھی۔“

”مسٹر کیوں کے حکم کے مطابق میں نے اس سے دستی پیدا کی تھی۔“

”کیا راجن بھی اُسی کے آدمیوں میں سے تھا۔“

”کہہ نہیں سلتا... ہو سکتا ہے کہ رہا ہو۔ مسٹر کیوں کے گروہ کے لوگ ایک دوسرے کو اس وقت تک نہیں جانتے جب تک کہ مسٹر کیوں خود نہ چاہے۔“

”راجن تمہیں اس کے بعد ملتا ہے۔“

”رہ... راجن...!“ ناگر ہکلا کر رہ گیا۔

”جھوٹ نہیں سنوں گا۔“ فریدی اب سے تیز نظروں سے گھوڑتا ہوا بولا۔

”اُسے مسٹر کیوں ختم کر دیا۔“

”کیسے؟“

”مجھے مسٹر کیوں کی طرف سے حکم ملا کہ میں راجن کو دلاور گروہ والی سڑک سے لے کر جھریاں کے جنگل میں مارڈاں دیں۔ بعد کے لئے ایک آدمی بھی دیا گیا تھا۔ حکم تھا کہ لاش کو پڑوں چڑک کر جلا دیا جائے۔“

”تو تم دونوں نے اسے مارڈا۔“

”نہیں....!“ ناگر گھبرا کر بولا۔

”پھر...؟“

”جب وہ ہم سے چھٹ کر بھاگ رہا تھا تو کسی نے سر کنڈوں کی جھاڑپوں سے اس پر فائر کر دیا۔ لیکن لاش ہمیں ہی جلانی پڑی تھی۔“

”دوسرے آدمی کون تھا۔“

”پتہ نہیں... اسی دن پر کے بعد سے اب تک نہیں دکھائی دیا۔“

”خراب یہ بتاؤ کہ تم اس کے چکر میں کس طرح پڑے تھے۔“

نگر تھوڑی دیر خاموش رہا پھر بولا۔ ”اس نے مجھے بلیک میل کیا تھا۔“

پھر اس نے اسی قسم کی ایک داستان دہرا دی جیسی حمید کو پاگل خانے میں ساجد نے سننا تھی۔ ناگر دراصل نشیات کی ناجائز تجارت کرتا تھا۔ مسٹر کیونے اسے ایک خط کے ذریعہ دی تھی کہ اگر اس نے اس کے احکامات کے آگے سرنہ جھکا دیا تو وہ اس کاراز فاش کر دے گوئے۔ اسے بھی بھی بدایت ملی تھی کہ وہ اپنے فیصلے سے فون کے ذریعے آگاہ کرے۔ نمبر وہی ”تمزیز“ تھا۔

”ٹیلی فون کرنے کے متعلق کوئی اور بھی بدایت ملتی تھی۔“ فریدی نے پوچھا۔

”ہاں.... کہ گفتگو شخصی ٹیلی فون کی بجائے کسی پیلک ٹیلی فون بوجھ سے کی جائے۔“

”اس کے بعد کسی قسم کی گفتگو یا مشورے کے لئے کون ساطریقہ اختیار کیا گیا ہے۔“ فریدی نے پوچھا۔

”مسٹر کیوں کے خطوط یا تو بزریہ ذاک آتے ہیں باکسی دوسرا نہ اسرار طریقے سے مجھ تک پہنچتے ہیں۔“

”نہ اسرار طریقے سے۔“ فریدی نے کہا۔

”جی ہاں.... آج ہی! جب میں آپ کے ساتھی کی حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کر رہا تھا مسٹر کیونے مکان کے ایک حصے میں فائر کر کے ہمیں اپنی طرف متوجہ کیا۔ جب ہم کرے مئے گئے تو ہمیں اس کا خط ملا اور ساتھ ہی ایک بوتل بھی جس میں غالباً سیال ایکونیا تھی۔ خط میں بدایت تھی کہ میک اپ بگاؤ نے کے لئے بوتل کا عرق استعمال کیا جائے۔“

”اوہ....!“ فریدی نے ہونٹ سکوڑ کر کہا تھوڑی دیر کے لئے پھر خاموشی چھاگی۔

”وہ بوٹکی کہاں ہے.... کوول....!“ حمید نے پوچھا۔

فریدی اسے گھورنے لگا اور حمید نے مسکرا کر منہ پھیر لیا۔

”کنوں.... میں نہیں جانتا کہ وہاں کہاں ہے۔“ ناگر نے کہا۔

”لیکن تم تیوں ساتھ ہی تو بھاگے ہو گے۔“ فریدی بولا۔

”ہم وہاں ساتھ ہی پہنچتے جہاں ہمیں خطرات کے وقت پناہ لینے کا حکم ملا۔ اس کے“

”میں بھاگ پڑا۔“

”کہاں گئے تھے۔“ فریدی نے پوچھا۔ لیکن ناگر نے فوراً ہی جواب نہ دیا۔  
”میا... میں یقین کر لوں کہ آپ میری حفاظت کریں گے۔“ ناگر نے پوچھا۔

”تحت الامکان....!“ فریدی کا مختصر ساجوب تھا۔

”ہم لوگ! بیلی روڑ کی کوئی نہر سترہ میں گئے تھے۔“

”کس کی کوئی نہیں۔“

”اس کا علم مجھے نہیں۔ پہلی ہی بار وہاں گیا تھا۔“

”پھر....!“

ناگر خاموش ہو گیا۔ اس پر پھر رعشہ طابری ہو گیا تھا۔

”اس کی یاد بھی میرے لئے پریشان کن ہے۔“ وہ کامپتا ہوا بولا۔

”سنودوست!“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔ ”ایک بات اور بھی واضح کرتا چلوں وہ یہ کہ مجھے ایکنگ اور حقیقت میں فرق کرنے کا کافی سیاق ہے۔“

”میں جو کچھ بھی کہنے جا رہا ہوں اس میں ذرہ برابر بھی جھوٹ نہیں۔“ ناگر بولا۔

”خیر.... چلو....!“ فریدی سکار سکانا ہوا بولا۔

”وہاں اس عمارت کے ایک کرے میں مجھے کسی کی آواز سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا ایک دروازے کے ٹوٹے ہوئے شیشے سے دو خفاک آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔ سرخ سرخ خونی آنکھیں۔ میری ہمت نہیں تھی کہ میں کسی طرح نظریں چڑا سکتا۔ میں ان کی طرف دیکھتا دھا اور مجھے ایسا محسوس ہوتا رہا جیسے میرے جسم کی ساری طاقت ان خوف ناک آنکھوں میں کھپتی جا رہی ہو۔ پھر مجھے ایک تیز قسم کی سرگوشی سنائی دی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے وہ آواز ان آنکھوں سے نکل رہی ہو۔ مجھے کہا جانا تھا کہ میں ایک بند گاڑی میں پلٹ نک جاؤں اور وہاں سے دریا میں چلا گا لگدوں۔ میں خاموشی سے مڑا اور باہر نکل آیا۔ اس وقت میرے ذہن میں صرف ایک ہی خیال تھا کہ مجھے دریا میں چلا گا لگانی ہے.... اچھی طرح یاد نہیں کہ میں پیدل بیلٹ نک آیا میں نے حقیقت کی بند گاڑی میں یہاں نک کا سفر کیا۔“

”تموں ساتھ ہی تو بھاگے ہو گے۔“ فریدی بولا۔

”ہم وہاں ساتھ ہی پہنچتے جہاں ہمیں خطرات کے وقت پناہ لینے کا حکم ملا۔ اس کے“

”میں بھاگ پڑا۔“

”آسمانی را لکل... میں اسکے متعلق کچھ نہیں جانتا۔“ تاگر نے کہا۔ ”کیا وہ بھی سُر کیوں...؟“ ”غائب...!“ فریدی اٹھ کر ٹھلتا ہوا بولا۔ تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر فریدی اس کی طرف مڑ کر بولا۔

”میں نے تمہیں اس سے محفوظ رکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ لیکن اگر تم نے مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی تو شاید میں تمہارے سُر کیوں بھی زیادہ خوفناک ثابت ہوں۔“

”میں آپ کو کس طرح یقین دلاوں... میں...!“

تاگر کی آواز حلقت میں گھٹ کر رہ گئی۔ فریدی چونکہ کر پلان۔ دروازے میں تین آدمی کھڑے تھے۔ تینوں کے ہاتھوں میں ریو الور تھے اور ان کے پیڑے سیاہ نقابوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔

## بموں کی بارش

فریدی کے سکون میں کسی قسم کا فرق نہ آیا۔ اس کے ہاتھوں پر ایک زہری لیٹی سی مسکراہٹ پھیل رہی اور آنکھوں سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کسی ڈڑائے کاری ہر سل دیکھ رہا ہو۔

”مکان چھوٹا ہے۔“ اس نے سمجھ دی گئی سے کہا۔ ”اور مہماں کا تانتا بندھ گیا ہے۔“

”اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔“ آنے والوں میں سے ایک نے سر گوشی کی حید اور تاگر نے اپنے ہاتھ اٹھایا۔ لیکن فریدی بدستور کھڑا مسکراہتا۔ تاگر بُرنی طرح کا تپ رہا۔

”مارنا مت۔“ دھنٹا فریدی چینا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے اس نے ان تینوں آدمیوں کے پیچے کھڑے ہوئے کسی آدمی کو مخاطب کیا ہو۔ تینوں چونکہ کر مڑے لیکن دوسراے ہی لمحے میں تینوں کے ریو الور زمین پر تھے اور فریدی ان پر بیل پڑا تھا۔ وہ تینوں ایک ساتھ پیچے کی طرف الٹ گئے۔

جید نے بے تباشہ چھلائیں لگائی اور زمین پر پڑے ہوئے ریو الوروں پر قبضہ کر لیا۔

”ابے او گیدڑ کے پچے۔“ حید نے تاگر کو لکارا۔ لیکن اس نے سر اٹھانے کی بھی ہمت نہ کر وہ اسے اسی حال میں چھوڑ کر باہر نکل آیا۔ فریدی ان تینوں نے گھماہو رہا۔

”ہیڈڑاپ۔“ حید آہستہ سے بولا اور فریدی انہیں چھوڑ کر الگ ہٹ گیا اور ان تینوں نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے۔

تھوڑی دیر بعد حید اور تاگر انہیں رسیوں سے بکڑا ہے تھے اور فریدی بیوی الور لئے کھڑا تھا۔ ”اب یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں۔“ فریدی نے حید سے کہا۔ ”تم دونوں یہیں ٹھہر و میں ابھی آیا۔“ وہ باہر چلا گیا اور حید قیدیوں کے چہروں سے نقاب فوچنے لگا۔

”ان میں سے کسی کو پہچانتے ہو۔“ حید نے تاگر سے پوچھا۔ تاگر نے فنی میں سر بلادیا۔

وہ تینوں سر جھکائے زمین پر بیٹھے رہے۔

”تمہیں کس نے بھیجا تھا۔“ حید نے انہیں مخاطب کیا۔ لیکن انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ ان میں سے دو تو خائف نظر آتے تھے۔ لیکن ایک کے پیڑے پر اب بھی خوفناک عزم کی جھلک تھی وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ فریدی اندر داخل ہوا۔ تینوں کو اٹھایا گیا۔ ان کے ہاتھ ان کی پشت پر بندھے ہوئے تھے۔

باہر کھڑی ہوئی کار میں انہیں دھکیل دیا گیا۔ اگلی نشست پر فریدی اور تاگر بیٹھے بیچلی پر جید تھا۔ بھروسوں میں سے دو نیچے تھے اور تیسرا سیٹ پر۔

”عقاب کا خیال رکھنا۔“ فریدی نے حید سے کہا اور کار اسٹارٹ کر دی۔

حید پچھلے شٹھے سے سڑک کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر ان کی کار جنگل کی طرف مڑ گئی۔ پل کے قریب والے کوارٹ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ان لوگوں نے جاتے وقت اسے بند کرنے کی بھی رخصت گوارا نہیں کی تھی۔ ان کے جانے کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد ایک دوسرا کار کار آکر دہال رکی اور اس پر سے ایک آدمی نیچے اتر۔ اس کے علاوہ اس کار میں اور کوئی نہیں تھا۔

اس نے بھی اپنا چہرہ سیاہ نقاب سے چھپا رکھا تھا۔ وہ چند لمحے کھڑا اور ہر دیکھتا رہا پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا کوارٹ کے دروازے کے قریب آگر رک گیا۔ شاید وہ آہستہ لے رہا تھا۔ اس نے جھاک کر اندر دیکھا۔ پھر ایک کنکری اٹھا کر کوارٹ کے اندر ورنی سائبیان پر پھیکی۔ میں کا سائبیان چیخ اٹھائیں اس کے علاوہ اور کوئی آواز نہ سنائی دی۔

دوسرے لمحے میں وہ کوارٹ کے اندر تھا۔ صحن میں ایک کرسی الٹی ہوئی میں جس کا ایک پا یہ ٹوٹا ہوا تھا۔ تینوں قیدیوں کے نقاب فرش پر پڑے ہوئے تھے۔ اس نے انہیں اٹھا کر دیکھا اور ایک غیب طرح کی آواز اس کے منہ سے نکلی جو کسی بھیڑیے کی غرابت سے بہت کچھ مشابہ تھی۔

پھر وہ برآمدے میں آیا چند لمحے اور ہر اور دیکھتا رہا۔ کرتے کا بلب روشن تھا۔

کمرے میں اسے ناگر کے بیچکے ہوئے کپڑے ملے جنہیں اس نے بہت اختیاط سے اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ تھوڑی دیر کمرے کی مختلف چیزیں اللٹے پلنے کے بعد وہ کمرے سے نکل آیا۔ ناگر کے کپڑے کار میں ڈال دیئے۔ اگلی سیٹ سے ایک چھوٹا سا صندوق المخایا جس سے ایک بڑا ساتار لکھ رہا تھا۔ زمین پر جھک کر اس نے فریدی کی کار کے نشانات دیکھے اور وہ صندوق ایک پیچے کے نشان پر رکھ دیا۔ نثار کا سلسلہ موڑ کی بیٹری سے ملاتے ہی صندوق کی سطح روشن ہو گئی۔ صندوق کا اوپری حصہ دراصل شیشے کا تھا۔ اس کے وینچے ایک بڑی سی سوتی تھی جو آہستہ آہستہ حرکت کر رہی تھی۔ سوتی کے گرد پیش بے شمار چھوٹی چھوٹی آڑی، ترجمبی، اور سیدھی لکیریں تھیں۔ کہیں کہیں قوسیں، دائرے اور زاویے بھی نظر آ رہے تھے۔ سوتی اپنا پکڑ پورا کرنے سے قبل ہی ایک جگہ رک گئی۔ اس نے جھک کر دیکھا۔

تھوڑی دیر بعد اس کی کار بھی اور ہر ہی جا رہی تھی جدھر فریدی کی گئی تھی۔

رات ڈھل رہی اور چاند افق کی طرف جھک رہا تھا۔ سانے کی چادر کا نشان پر محیط تھی۔ چھپوں کے جنگلوں میں گھستے ہی فریدی کو کار کی رفتار کم کر دینی پڑی تھی راستہ ناموار تھا اور بار بار حید سوچنے لگتا تھا کہ کہیں کار الٹ ہی سہ جائے۔ چاند کے غروب ہوتے ہی اندر ہمراپھیل گیا۔ دفعہ نامید کے منہ سے عجیب سی آواز نکلی۔

”کیا بات ہے۔“ فریدی نے چونک کر پوچھا۔

”تعقیب...!“

”کیا...؟“

”جی ہاں... جھاڑیوں میں... ابھی دور ہیڈلا نہیں چکیں تھیں... غالباً کوئی کار ہی ہے۔“

”مک... کون؟“ ناگر ہکلا کر رہ گیا۔

”تینوں قیدیوں نے اچھلنا شروع کر دیا تھا۔“

”ذرالان کی کنٹی سہلاؤ۔“ فریدی نے حید سے کہا۔

حید کے تین ہی گھونسوں نے انہیں خاموش کر دیا۔ گھونے کنپیوں پر مارے گئے تھے۔

”ان میں سے کوئی ہوش میں تو نہیں۔“ فریدی نے تھوڑی دیر بعد پوچھا۔

حمد انبیاء اچھی طرح ہلا کر دیکھنے کے بعد بولا۔ ”سب ٹھیک ہے۔ اودہ روشنی پھر...  
زب ہی معلوم ہوتی ہے۔“

فریدی نے کار روک دی لیکن انہیں کیا۔ پھر وہ ناگر کو بازو سے پکڑ کر اتر گیا۔ حید اس کے پیچے تھا۔

وہ تینوں قریب کی جھاڑیوں میں چھپ گئے۔

تھوڑی دیر بعد انبیاء بچھے ایک کار دکھائی دی جو ان کی کار سے تھوڑے فاصلے پر رک گئی۔ فی اور اس کی ہیڈلا نہیں کی روشنی ان کی کار کے پچھلے حصے پر پڑ رہی تھی۔ حید نے ریوالر نکال لیا۔ ایک آدمی کار سے اتر کر بچھے کھڑا ہو گیا۔

”شش...!“ فریدی حید کا بازو پکڑ کر آہستہ سے بولا۔ ”اسے کار کے قریب آنے دو۔“ اس آدمی کے انداز سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ فریدی کی کار کی طرف بڑھنے کا ارادہ کر رہا ہو۔ وہ چند لمحے اسی طرح کھڑا رہا۔ پھر اپنی کار میں بیٹھ کر اسے بچھے کی طرف لے جانے لگا۔

”چلو بڑھو...!“ فریدی آہستہ سے بولا۔ ”کوئی خطرناک ارادہ۔ اس کے قریب ہی رہو۔“ وہ تینوں اس کی کار کے ساتھ ہی ساتھ بچھے کی طرف چلتے رہے۔ کار کافی پرانے ماذل کی اور لیا تھی۔ اس نے اس کا انہن خاصا شور مچا رہا تھا۔ بھی وجہ تھی کہ فریدی نے جھاڑیوں کی لڑکڑاہٹ کی بھی پروادہ نہیں کی تھی۔ اسے یقین تھا کہ انہن کے شور میں جھاڑیوں کی آوازیں اب جائیں گی۔ تقریباً ایک فرلانگ کا فاصلہ نظر کرنے کے بعد کار رک گئی اور انہن بند ہو گیا۔

تلکیا اور سانے کا وہی عالم تھا۔

”آخر یہ کیا کرنے جا رہا ہے۔“ حید نے سر گوشی کی۔

”دیکھتے جاؤ۔“ فریدی بولا۔

ناگر کا پرہا تھا۔

”اماں تم آدمی ہو یا بدی جھوں۔“ فریدی نے اس کے کانہ سے پرہا تھر رکھ کر کہا۔ ”ریوالر کی نہ اسے ہی رکھنا، ورنہ کہیں اپنے ہی گولی نہ مار لو۔“

پھر وہ حید کی طرف مڑ کر بولا۔ ”ضورت کے وقت فائز کرنے کی اجازت ہے۔“

وہ تینوں سینے کے بل ریغتے ہوئے جھاڑیوں سے نکلے.... لیکن کار بالکل خالی تھی۔

”چلنے کا رکھ خبر لیں۔“ تاگر بولہ۔  
”کار... شاید کار کے ٹکڑے بھی نہ ملیں۔ کیا تم روشنی نہیں دیکھ رہے ہو۔ آگ چاروں  
طرف پھیل رہی ہے۔ بس اب بیہاں سے نکل چلو۔“

”مجھ میں اب چلنے کی بھی تاب نہیں۔“ حمید ہانپتا ہوا بولا۔  
”چلو تو آدمیری پینچھے پر۔“ فریدی نے کہا۔

فریدی نے اُسے پینچھے پر لاد لیا۔ آگ پھیلتی جا رہی تھی... تاگر کو یہ دیکھ کر جرت ہوئی کہ  
فریدی اب بھی اتنی ہی آسانی سے دوڑ رہا تھا جتنی آسانی سے اب تک دوڑتا آیا تھا۔ تاگر کی سانس  
بڑی طرح پھول رہی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ کاش سانس ہی درست کرنے کا موقع مل جاتا۔

سرٹک پر پہنچ کر فریدی نے حمید کو اتار دیا۔ تاگر گر کر زمین پر ہانپتے گا۔

”میرا خیال ہے کہ مسٹر کیو کے گروہ میں تم سب سے کچھ تھے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”اگر... میں... میں.... آپ کے ساتھ... نہ ہوتا... تو... میرا ہارٹ فل  
جو جاتا۔“

”وہ کار کس کی تھی۔“ حمید نے پوچھا۔

”سر کار دی۔“ فریدی بولا۔ ”بھی جلدی کرو! کم از کم دس میل پیدل چلانا پڑے گا۔“

”کیا بے نی ہے۔“ حمید مضمحلہ سی بھی کے ساتھ بولا۔

”ہے تو۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔ ”لیکن اگر ایسے میں تمہیں کوئی لڑکی مل جائے تو۔“

”جنہم میں گئی لڑکی۔“ حمید غرما کر بولا۔

”کیوں بھی تاگر۔“

”بھی... مجھے تو آپ مسٹر کیو سے بھی زیادہ عجیب معلوم ہوتے ہیں۔“

”وہ تینوں مفت میں مارے گئے۔“ حمید نے کہا۔

”بھی چلتے رہو۔“ فریدی سکار سکانا ہوا بولا۔

”مجھے تو اب بھی یقین نہیں کہ میں زندہ ہوں۔“ تاگر خوف زدہ آواز میں بولا۔

”کیوں...؟“

”مسٹر کیو! ایسے آدمیوں کو زندہ نہیں چھوڑتا جنہیں سمجھتا ہے کہ وہ پولیس کے ہاتھ لگ

”وہیں مار لیتے تو بہتر تھا۔“ حمید بڑا بڑا۔

فریدی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ایک زور دار دھماکا سنائی دیا۔ پھر دوسرا اور ایسا معلوم ہوا جسے پورے جنگل میں آگ لگ گئی ہو۔

”مجاگو...!“ فریدی حمید کا ہاتھ کھینچتا ہوا بولا۔

وہ تینوں تیزی سے پیچھے کی طرف دوڑ رہے تھے۔

”آخر... بب... بات کیا ہے۔“ حمید ہانپتا ہوا بولا۔ ایک دھماکا اور ہوا۔

”شاید اس نے کار پر بم مارا ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”اور اب ادھر ادھر نصیب رہا ہے۔“

”م... مسٹر کیو...!“ تاگر نے رونی آواز میں پوچھا۔

پھر دھماکہ ہوا۔ کار کے انجن کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔

”جھاڑیوں میں... گھسیں؟“ حمید نے پوچھا۔

”بس بھاگتے رہو... ایسی حادثت نہ کرنا۔ یہ بم غالباً ادھر ادھر کی جھاڑیوں ہی میں پیچے  
جاری ہے ہیں۔“

”تب تو مارے ہی گئے۔ میں پہلے ہی کہہ رہا تھا۔“ حمید ہانپتا ہوا بولا۔

”بیٹے! حمید خال! اس وقت اُس سے الجھنا ٹھیک نہیں۔ معلوم نہیں اسکے پاس کتناے اور بم ہوں۔  
کار کی ہیڈ لائنس کا عکس سامنے کی جھاڑیوں کے اوپری حصے پر پڑ رہا تھا۔ کار شاید کسی پیچے  
نشیب میں تھی۔ ایک دھماکہ کہیں قریب ہی ہوا اور تیز قسم کی روشنی کے ساتھ ہی انہوں

آنچ بھی محسوس کی۔ دوبارے ہی لمحے میں کار سر پر تھی۔ تینوں نے داہنی طرف کی جھاڑیوں نہ  
چھلانگ لگادی۔ فریدی نے پلٹ کر کار پر فائر کیا۔ دوریوں اور اور چلے۔ لیکن کار تیزی سے گزر کی  
وہ بھی تک فائر کئے جا رہے تھے۔

”چلو بس بھی کرو۔“ فریدی جھلائی ہوئی آواز میں بولا۔

کار کے انجن کی آواز کہیں دور سنائی دے رہی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ بھی سنائے میں گھل مل کر  
بڑی چوت ہوئی۔“ حمید بولا۔

”اس کے علاوہ نہیں کہ اب پیدل چلتے چلتے کچور نکل جائے گا۔“ فریدی نے کہا۔ ”  
بھوں کا اٹاک ختم ہو گیا تھا۔“

جائیں گے۔

”مگر اتم کہتے ہو کہ کسی نے اسے آج تک دیکھا ہی نہیں ہے۔“

”بھی ہاں!“

”پھر اسے کس بات کا خوف ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اس کے ساتھیوں کو پولیس پکڑ بھی لے تو خود اس پر ہاتھ پڑنا ماحل ہے۔“

”وہ یہ بھی نہیں چاہتا کہ کسی کو اس کا نام ہی معلوم ہو سکے۔

”اوہ....!“ فریدی نے کہا اور پچھے سوچنے لگا۔ ”ٹھیک ہی تو ہے۔ اگر پولیس کو یہ معلوم ہو گی کہ کوئی مجرم سیکرٹ سروس والوں کی شیلی و سکی ٹرانسٹشن سروس استعمال کر رہا ہے تو اسے بند کر دے گی اور مسٹر کیوائیک بہت بڑی آسانی سے محروم ہو جائے گا۔“

”تب تو یار ناگر۔“ فریدی نے سمجھ دی سے کہا۔ ”تمہیں مر ہی جانا چاہئے۔“

”نج... جی....“ تاگر چلتے چلتے رک گیا۔

”ہاں! تمہیں مر جانا چاہئے۔“

”لیکن....!“ وہ تھوک ٹکل کر بولا۔ ”آپ نے وعدہ کیا تھا۔“

”ٹھیک ہے۔ میں نے وعدہ کیا تھا کہ تمہیں مسٹر کیو سے بجاوں گا۔ لہذا میں اسی وقت تمہیں دوبار پچاڑکا ہوں۔ لیکن میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ تمہیں زندہ رہنے دوں گا۔“

”تاگر کے منہ سے اسی آوازیں نکلے لگیں جیسے اسے فرنجک ہو گئی ہو۔“

”چپ رہو گاگس....!“ حمید اس کی پیشہ پر گھونسہ جھاڑ کر بولا۔

”میں مر جاؤں گا۔“ تاگر نے گھٹی گھٹی سی آواز میں کہا۔

”اچھا! تو لڑ و بانش کی بات ہو رہی تھی۔“ حمید نے بڑے بڑے دردی سے قہقہہ لگایا۔ ”ظاہر ہے کہ مارے جاؤ گے تو ضرور مر جاؤ گے۔“

”محجے معاف کر دیجئے۔“ تاگر گھٹکھیا کر بولا۔

”ابھی نہیں! مر جاؤ گے تب۔“ حمید نے جھلا کر کہا اور فریدی ہنسنے لگا۔

”واقعی تم بڑے ڈرپوک ہو۔“ فریدی اس کا شانہ ٹھپٹتا ہوا بولا۔ ”محجے حرمت ہے کہ مسٹر جیسے ممتاز آدمی نے تمہیں کس طرح اپنے گروہ میں شامل کر لیا تھا اور مجھے تواب اس میں بھی شیرے ذہن میں تھا کہ مجھے دریا میں کو د جانا چاہئے.... نہیں نہیں میں مرنا نہیں چاہتا۔“

ہے کہ تم نشیات کی ناجائز تجارت کرتے رہے ہو۔ ایسے لوگ بھی تھوڑے کیا کافی دلیر ہوتے ہیں۔“  
تاگر پچھہ نہ بولا۔

”خیر میں تمہیں خود نہیں ماروں گا۔“ فریدی نے تھوڑی دیر بعد کہا۔ ”تمہیں خود کشی کرنی پڑے گی۔“  
”خود کشی۔“

”ہاں.... ظاہر ہے کہ مسٹر کیو نے تمہیں پہنچا نیز کر کے خود کشی ہی کے لئے بھیجا تھا اور اس نے تمہارے پیچھے کسی کو لگا بھی دیا تھا جس نے اسے اطلاع دی کہ تم مر نے سے بچالنے گے ہو۔“  
”پھر....؟“

”پھر یہی کہ تمہیں خود کشی کرہی لئی چاہئے ورنہ مسٹر کیو کو بڑا دکھ ہو گا اور میں نہیں چاہتا کہ اس بے شہار ایتیم کا دل دکھ۔“

”آپ مذاق کر رہے ہیں۔“ تاگر خوفزدہ آواز میں نہسا۔

”ویسے! تم رہتے کہاں ہو۔“ فریدی نے پوچھا۔

”بھیں جانا کہاں ہے۔“ حمید نے جھلا کر پوچھا۔

”بکومت... ہاں... تم نے نہیں بتایا۔“

”پرن لین میں۔“

”مالدار آدمی معلوم ہوتے ہو۔“ فریدی نے کہا۔ پھر قدرے توقف سے پوچھا ”اور کون کون ہے تمہارے ساتھ۔“

”کوئی نہیں.... میں تمہارہ تھا ہو۔“

”تب خود کشی کے لئے کھڑی مناسب رہے گا۔“

”نہیں! نہیں۔“ تاگر کامپتا ہوا بولا۔ ”میں بالکل ویسا ہی محسوس کر رہا ہوں.... دریا میں کوئنے سے قبل.... نہیں.... میں خود کشی نہیں کروں گا۔“

”کیا محسوس کر رہے ہو۔“ حمید نے پوچھا۔

”بالکل یہی کہ مجھے خود کشی کر لیتی چاہئے۔ دریا میں کوئنے سے قبل بھی یہی ایک خیال میرے ذہن میں تھا کہ مجھے دریا میں کو د جانا چاہئے.... نہیں نہیں میں مرنا نہیں چاہتا۔“

”اوہ! یہ بھی کوئی بڑی بات ہے۔“ حمید اپنی نعلیٰ موچھوں کو اینٹھا ہوا بولا۔ ”سول ہبتال سے ایک لاوارث مردہ لے کر اُس پر تمہارا میک اپ کر دیا گیا۔“  
”لیکن.... مردے میں خون کہاں سے آیا ہو گا۔“  
”یاد تم ڈیوٹ ہو! اُرے بکرے کا خون۔ ویسے تم بھی کسی بکرے سے کم نہیں ہو۔“ حمید نے کہا۔ ”اب تم خود کشی کی وجہ بھی پوچھو گے۔“  
”بیکھنا....!“

”تمہارے مشر کیوں کو مطمئن کرنے کے لئے درستہ وہ تمہیں پاہال میں بھی نہ چھوڑتا۔“  
”کوئی اور وجہ۔“ تاگر نے پوچھا۔ ”ظاہر ہے کہ آپ لوگوں کو جھسے ہمدردی نہیں ہو سکتی۔“  
حید تھوڑی دیر یک آسے غور سے دیکھا رہا پھر بولا۔  
”مجھے اب بھی تم پر شہر ہے۔“  
”سک بات کف! تاگر چوک کر بولا۔“  
”یعنی کہ کہیں تمہاری کھوپڑی میں بھس کے بجائے عقل تو تمیں بھری ہوئی ہے۔“ حید نے کہا اور اشناز سے ایک دیٹر کو بلدا کر اس سے بولا۔  
”ایک کام کرو گے.... اوہ اچھا.... تھیک! یہ سانتے اخیار کا دفتر یہ ٹالیہاں ایک مس روشنیوں... جانتے ہو گا۔ تو یہ لفاقت اتحاد دے آئے کیا سمجھے؟“  
حید نے اس طرح اسے آنکھ مددی جیسے اس لفاقت میں کوئی حقیقی خطا ہو۔  
”تھوڑی لو اپنا انعام۔“ اس نے ایک درپیہ اس کے ہاتھ پر رک دیا۔ وہ سلام کر کے چلا گیا۔  
”کیوں آتے۔“ تاگر اپنی ایک آنکھ دبا کر سکریا۔  
”تاگر....!“ حمید نے سنجھ گئے اسے گاہل کیا۔

”فرمائیے“  
”تم نے کبھی عشق کیا ہے۔“  
”سک سے۔“  
”سکی سے۔“

”ہاں....!“ تاگر کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”مجھے زندگی کے ہر حصے میں دولت سے عشق رہا ہے۔“

”تم اپنے گھر میں خود کشی کر دے گے۔“ فریڈی نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔  
تاگر کے منہ سے ایک گھٹی گھٹی سی تیج نکلی اور بیہو ش ہو کر گر پڑا۔

## خفیہ پیغام

تیرے دن پر نسلیں کی کوئی نمبر گیرا رہ میں ناگر کی لاش پائی گئی۔ داہمی کپٹی پر گولی گلی۔ پولیس کو اس تیجے پر چینپا پڑا کہ وہ خود کشی کا کیس تھا۔ کیونکہ قریب پڑے ہوئے ریوال کے دستے پر مرنے والے ہی کے انگلیوں کے نشانات ملے تھے۔ کوئی کی تلاشی لینے پر کافی مقدار میں کوئین برآمد ہوئی اور پھر کچھ کاغذات بھی ملے۔ جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ مرنے والا بڑے پیانے پر فرشتات کا ناجائز لینے دین کرتا تھا۔

کوئی کے باہر کافی بھیڑ تھی جس میں اخباروں کے روپوزٹر بھی تھے۔ پولیس نے کسی کو بھی اندر نہیں جانے دیا۔ سر جنت حید تھوڑی دیر یک آنکھوں کی چمگی میان ستارا پھر دہاں سے چل پڑا۔ اس کے چہرے پر گھنی موچھیں تھیں اور آنکھوں پر تاریک شیشوں کا چشمہ۔ لباس شکاریوں جیسا پین رکھا تھا۔ اس نے ایک ٹیکسی کی اور پھر روز نامہ نیو اسٹار کے دفتر کے قریب اتر گیا۔ دفتر کے سامنے والے ریستوران میں داخل ہو کر اس نے اوہر اور ہر دیکھا۔ دوسرے کنارے پر بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے مسکرا کر اسے آنکھ ماری اور حید تیز تیز قدم اخناٹا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔

”کیا رہا؟“ اس آدمی نے پوچھا۔

”تمہاری خود کشی خاصی کامیاب رہی۔“ حید بیٹھتا ہوا بولا۔

تاگر بہنے لگا۔ اس کے چہرے پر بھی فریڈی نے اپنی استادی دکھائی تھی۔ اتنا شاندار میک اپ تھا کہ خود تاگر ہی پہلے اچھبے میں پڑ گیا تھا۔

”کافی بھیڑ ہو گی۔“ تاگر نے پوچھا۔

”کچھ مت پوچھو تمہاری شادی پر بھی اتنے آدمی الٹھانے ہوتے۔“

”لیکن لاش کہاں ملی تھی۔“

”دھت...!“ حید نے برا سامنہ بنا کر کہا۔ ”تم فلسفی معلوم ہوتے ہو... خیر تھیں کنوں نہیں پسند آئی تھی۔“

”دولت کسی ایک کنوں کی پابند نہیں ہوتی۔“ تاگر مسکرا کر بولا۔ ”مگر وہ دوسرا...“  
میں اسے کبھی نہ بھلا سکوں گا۔“

”اوہو! بر سینیل تذکرہ... یہ تو بتاؤ کہ اس رات کیا مجھے پہچان کر بے وقوف بنایا گیا تھا۔“

”طفی...!“ تاگر سر ہلا کر بولا۔ ”کنوں تھیں پہچانتی تھی۔ اُس نے تو یہاں تک تباہیا تھی  
وہ کیڈیاں مسٹر فریدی کی تھی۔ حید صاحب! میرا خیال ہے کہ کنوں اس گروہ کے بہتر  
دماغوں میں سے ہے اور اس جبھی کی تو اس سے روح فار ہتی ہے۔“

”ہے زوردار...!“ حید نے اپنے پانچ میں تماکو بھرتے ہوئے کہا۔

”دنیا کی مکار تین لڑکی کہہ لو۔“ تاگر بولا۔

”تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر تاگر ہی بولا۔“

”اب ہمیں کیا کرنا ہے۔“

”ہدایات کا منتظر۔“

”مسٹر فریدی کہاں ہوں گے۔“

”خدا ہی جانے! تمہارے مسٹر کیوں کو بھی دانتوں پیسنے آجائے گا۔“

”میں بھی پچھے ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں۔“ تاگر پچھے سوچتا ہوا بولا۔ ”کیا یہ کم حرمت انگیزت  
کہ میں نے خود کشی بھی کر لی ہے اور زندہ بھی ہوں۔ میری بگدگ دراصل جیل خانہ میں ہوئی چاہتے  
تھی۔ لیکن محلہ سراغ رسانی کے ایک آفیسر کے ساتھ بیٹھا غمیں مادر رہا ہوں۔“

”شش...!“ حید نے اُسے خاموش رہنے کا اشتادہ کیا۔ اس کی نظریں دروازے کی رفت اٹھ  
ہوئی تھیں جہاں کرامہ رپورٹ انور سا اور محلہ سراغ رسانی کا بوڑھا اُنپیٹر آصف داخل ہو رہے تھے۔

انور ایک جواں سال خوبصورت، ذین مگر لاپرواہ آدمی تھا۔ ظاہر توانیک معمولی کرامہ رپور  
تھا۔ لیکن شہر میں ہونے والے جرام سے اس کا تھوڑا بہت تعلق ضرور ہوا کرتا تھا۔ لیکن:

ہوشیار تھا کہ قانون کی گرفت میں آئنے سے قبل ہی کوئی نیا قند کھڑا کر کے الگ ہو جاتا۔ لیکن  
کے آفیسروں میں فریدی کیے علاوہ اور کسی بے نہیں دیتا تھا۔ فخریہ کہتا تھا کہ میں فریدی کا شا

لے انور اور رشیدہ کے کارنا موں کے لئے جلد نمبر 4 اور جلد نمبر 5 ملاحظہ فرمائیے۔

ہوں رشیدہ اس کی دوست تھی۔ دونوں ایک ہی دفتر میں کام کرتے تھے اور ایک ہی فلیٹ میں  
رہتے تھے۔ رشیدہ کافی حسین مگر مضبوط اعضاء کی لڑکی تھی۔ چال ڈھال میں نسوانیت کی بجائے  
 واضح قسم کی مردگانی رکھتی تھی۔

انپیٹر آصف محلہ سراغ رسانی کے ان آفیسروں میں سے تھا جو عموماً دسرے کے کاندھے  
پر کھکھ بندوق چلانے کے قائل تھے۔ اس پر جب بھی کوئی آفت آتی وہ انور کے پیچھے لگ جاتا۔  
اس سے مدد کا طالب ہوتا، بھی خوشامدیں کرتا اور کبھی دھونس دھڑلے سے کام نکالنے کی کوشش  
کرتا۔ انور اسے عموماً ”بوز ہے میئے“ کہہ کر مخاطب کرتا۔ وہ تینوں حید اور تاگر کے قریب ہی ایک  
خالی میز پر آبیٹھے۔

”انور آصف سے کہہ رہا تھا۔“ چلو جلدی سے آرڈر پلیس کرو۔“

”تم ہمیشہ گردن ہی کامنے کی فکر میں رہتے ہو۔“ آصف نہ کر بولا۔ ”خیر... بواۓ۔“  
اس نے ویژہ کو بلا کر تین آدمیوں کے لئے لنج کا آرڈر دیا۔

”ہوں... اب کہہ چلو۔“ انور رشیدہ کی طرف دیکھ کر مسکرا۔

”ظاہر ہے کہ تم اس موقعے پر نچلے نہ میٹھو گے۔“ آصف نے کہا۔ ”میں یہی کہنا چاہتا تھا کہ  
اگر مجھ سے مل کر کام کرو تو کیا حرج ہے؟“

”چلو منظور ہے۔ میں مرتبہ دم تک تم سے مل کر کام کر بنا رہوں گا۔ کام بھی تو بتاؤ۔“

”اُنہوں نے لگے آخر! میرا خیال ہے کہ تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔“

”خیر یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔“ انور مسکرا کر بولا۔

”آخر وہ رائق لعل... کس کی ہو سکتی ہے۔“ آصف نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”غیری ہی ہے۔“ انور نے سمجھ دی اور لاپرواہی سے کہا۔

”پھر وہی۔“ آصف بگڑ کر بولا اور رشیدہ ہنسنے لگی۔

جمید اور تاگر آس کر کیم کھانے میں مشغول تھے۔

”تمہارے استاد۔“ آصف تھوڑی دیر کے بعد بولا۔ ”تو نہ جانے کس چوہے کی بل میں  
جا گھے ہیں۔“

”اور آخر میں یقیناً کسی ہاتھی کی سوٹھ پکڑے ہوئے برآمد ہوں گے۔“ انور بولا۔

"ہونہے...!" آصف نے برا سامنہ بنایا۔

و شیر نے کھانا میز پر لگادیا تھا۔

"بہر حال تم اطلاعات چاہتے ہو۔" انور نے کہا۔ "لہذا سب سے بڑی اطلاع یہ ہے کہ بھی تک میں تو خود ہی اندر ہیرے میں ہوں۔"

"میں اسے تعلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔"

"تم تو شاند اسے بھی تعلیم نہ کرو کہ بعض اوقات تم بڑے حسین معلوم ہوتے ہو دیے بر سیل تک رہ میرے پاس سگریٹ بھی نہیں ہیں۔"

"تم ڈاکو ہو۔" آصف بگڑ کر بولا۔ "میرے پاس زیادہ پیے نہیں ہیں۔"

"کیوں! کیا اب اس فیشن اسیل بوڑھی عورت سے کچھ نہیں ملتا جس نے مار بن روڑ پر جن خانہ کھول رکھا ہے۔"

آصف تھیر آمیز نظر وہی سے انور کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر کچھ بڑا تھے ہوئے اس نے جب سے پرس کیا۔

انور نے ویٹر کو آنکھ کے اشارے سے بلا کر آہستہ سے کہا۔ "اسیٹ ایکپر لیں کے دوں۔" "دو نہیں ایک۔" آصف جلا کر بولا۔

"اس عورت کے پاس ایک لڑکی بھی....!"

آصف نے انور کو جملہ نہ پورا کرنے دیا۔ دس کا ایک فوٹ نکال کر ویٹر کے ہاتھ میں تھا۔ ہوا جلدی سے بولا۔ "چلو بھاگ کر جاؤ دو ہی لانٹا۔"

پھر وہ تھیر آمیز نظر وہی سے انور کو گھومنے لگا۔ رشیدہ دوسری طرف من پھیر کر مسکاری تھی۔

"آج کل میں بڑی پیشانگوں میں جلا ہوں۔" انور سر جھکائے ہوئے بڑا نے لگا۔ "قیمت!

تمن ملہ کا کرایہ چڑھ گیا ہے۔ لا غری والے نے تقاضوں کی بھرپڑ کر رکھی ہے۔ رشیدہ کا الگ قرض دار ہوں۔"

"یاد تم کیوں میرے بیچھے پڑ گئے ہو۔" آصف بے سی سے بولا۔

"صرف دوسروں پر مجھے بلور قرض دیے دو۔" انور اسی طریقہ سر جھکائے ہوئے بولا۔ "پرانی لو اکر دوں گا۔"

"میں کوئی قارون ہوں۔" آصف نے جھلا کر کہا۔

"خیر نہ دو۔" انور نے مخصوصیت سے کہا۔ "ویسے میں دوسرا طریقہ بھی اختیار کر سکتا ہوں۔"

"تم کچھ نہیں کر سکتے۔" آصف بگڑ کر اٹھا۔

"یہ تو تم کچ کہہ رہے ہو۔" انور نے ٹھنڈے پانی کا گلاس چڑھا کر پیٹ پر پا تھوڑے پھیرتے ہوئے کہا۔

سگریٹ آنگٹے اور ویٹر میز صاف کر کے چلا گیا۔ آصف انور کو بدستور گھورتا رہا۔

"تم خود کو نہ جانے کیا سمجھتے گے ہو۔" اُس نے کہا۔

"ایک ایسا یتیم جو قطفی ہے سہارا ہو۔" انور مسمی صورت بنا کر بولا۔

آصف کی جھلاہٹ اور بڑھ گئی اور وہ رشیدہ کی طرف ہڑ کر بولا۔

"تم بھی نہیں سمجھاتیں اسے ابھی یقین ہے کہ کسی دن بڑی مصیبت میں پھنس جائے گا۔"

"بھی کبھی سمجھا دیا کرو بھی۔" انور نے سنجیدگی سے کہا اور رشیدہ نہ پڑی۔

آصف بل ادا کر کے اٹھنے لگا۔

"تو تم میری مدد نہیں کرو گے۔" انور نے کہا۔

"نہیں..... نہیں..... نہیں۔"

"خیر اب اس عورت کی خیر نہیں.... اور جو کچھ بھی بیان وہ عدالت میں دے گی ظاہر ہے۔"

"تم مجھے بیک میل کرنا چاہتے ہو۔"

"بھتی بھی طرح دیتا ہوں اتنا ہی تم سر پر چڑھتے ہو۔"

"خیر اگر میں سر پر چڑھا ہو تو تم ٹوٹی ہوئی ہڈیوں اور لوٹھروں کا ذہیر ہوتے۔"

"آخر تم چاہتے کیا ہو۔" آصف ایک جھٹکے کے ساتھ بیٹھتا ہوا بولا۔

"تم میری مدد کرو! میں تمہاری مدد کروں گا اور ساتھ تھی دعا کروں گا کہ خدا میر اور تمہارا

نیز اپار کر دے۔"

تم مجھے ایک جھے بھی نہیں لے سکتے۔"

"تمہاری بھرپڑی! میں زبردستی کا قائل نہیں۔" انور نے آہستہ سے کہا اور اس کے چہرے پر

فرشتوں کی سی مخصوصیت نظر آئے گی۔

"اچھا بچھے ہی میتے میں مجھے سے ڈھانی سو لے چکے ہو۔"

”اور کیا....؟“

”میرے لئے کچھ نہیں لکھا۔“

”نہیں....بہت ممکن ہے کہ آگے چل کر تم بھی جھوکے جاؤ۔“

”شاید یہ میرے لئے پہلا اتفاق ہے کہ شہر میں ہونے والے کسی جرم کے متعلق لا علم ہوں۔“

”رشیدہ کی نظریں اس کے چہرے پر جھی ہوئی تھیں۔“

”اوہ....!“ انور پر خیال انداز میں بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ یہ وہی را کُل والا چکر ہے۔“  
یہ کہا۔ یہ سب کچھ نہیں لکھا۔“

”خط کس سے ملا۔“

”نہیں کے لیک ویٹر سے۔“

”ہوں۔ میرا خیال ہے کہ فریدی صاحب کے ہاتھ کوئی کڑی آگئی ہے۔ اسی لئے ان پر حملہ  
بھی ہوا تھا۔“

”ہو سکتا ہے....وہ ما نیک و فون والا معاملہ بھی معمولی نہیں تھا۔“

”اور شاید وہی حملہ کا باعث بھی تھا۔ فریدی صاحب کے اس اعشار نے اس عجیب و  
فریب اسلحے کو قریب قریب بیکارتی کر دیا۔“

”سر جنت حمید کا بھی کہیں پڑے نہیں۔“ رشیدہ بولی۔

”سامنہ نہیں ہو گا۔“

”اچھا تو اب وقت ہو رہا ہے....میں چل۔“ رشیدہ کلائی کی گھری دیکھ کر احمدی ہوئی بولی۔

”کچھ پیسے ہیں تمہارے پاس۔“ انور نے کہا۔ ”خجواہ پڑے لیتا۔“

”ایک پانی بھی نہیں....میں نہیں دے سکتی۔“

”نہ جانے کیوں آج بہت حسین لگ رہی ہو۔“

”نہیں میں جشن ہوں۔“ رشیدہ نے منہ بننا کہا اور باہر نکل گئی۔

انور اپنائی تیکھی سے ہونٹ سکوڑے ہوئے سیٹی بجائے کی کوشش کر رہا تھا۔

”یہ بھی تو سوچو کہ تم نے چھپلے میئنے میں لو ہے کی چور بازاری کے سلسلے میں ذیز  
کمائے تھے۔“

”آہستہ بولو۔ آصف ادھر اُدھر دیکھ کر بولا۔“ عجیب لغو آدمی ہو۔

”بہر حال اگر تم نے ڈیڑھ ہزار میں سے ڈھانی سو نکال دیئے تو کون سا براہماں کیا۔“

”میں ایک پانی بھی نہ دوں گا۔“

”ماں گناہ کوں ہے تم سے۔“ انور بھی بگڑ کر بولا۔ ”میں براہ راست اسی سے معاملہ طے کر لوں گا۔

”لیا...!“ آصف اچھل کر بولا۔ ”تم اس سے بات بھی نہیں کر سکتے۔“

”بات!“ انور سمجھیگی سے بولا۔ ”میں اسے قلمی گیت تک سناؤں گا۔“

”خیر دیکھ لوں گا۔“

”تمہاری آنکھیں کمزور معلوم ہوتی ہیں۔ چشمہ لگا کر دیکھنا۔“

”اچھا...!“ آصف دانت پیتا ہوا بولا۔ ”دیکھا جائے گا۔“

وہ تیزی سے ریسٹوران سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد ہی ناگر اور حمید بھی اٹھ گئے۔

رشیدہ انور کو مسکراتی ہوئی نظرؤں سے دیکھ رہی تھی۔

”تم کسی دن ضرور چھنسو گے۔“ اس نے کہا۔

”ٹکار نکل گیا۔“ انور ہاتھ ملتا ہوا بولا۔

”ہر مہینے تلو ملتے ہو! غریب کو۔“

”غریب کہتی ہو۔ اس لکھ پتی کو اس نے برا راشی شاید پورے مجھے میں کوئی نہ ہو۔“

”حالت تو چھاروں جیسی بیانے رکھتا ہے۔“

”توابی کر کے گردن تھوڑا ہی کٹوائے گا۔“ انور بولا۔

”اُبھی ابھی فریدی صاحب کا خط ملا۔“ رشیدہ نے تھوڑی دیر بعد کہا۔

”کیا لکھا ہے؟“

”جیس ایندھ جعفری کی فرم کے لئے ایک لینڈی اشیونا پس کی جگہ نکلی ہے! آج ہی انہیں۔“

فریدی صاحب نے لکھا ہے کہ میں اندر ویو میں جاؤں۔“

”تو گویا.... وہ چاہتے ہیں کہ تم اس فرم میں ملازمت کرو۔“

## ڈراؤنا آدمی

”آہم...!“ اس نے غرما کر سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔  
رشیدہ بیٹھ گئی۔ لیکن نہ جانے کیوں اس کا حلن خلک ہونے لگا تھا ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے جنم  
ہارشیدہ کا پر رہا ہو۔

”آہم... نام...!“ وہ غرایا۔

”رشیدہ...!“ وہ سر جھکائے ہوئے ہوئی۔

”تعلیم...!“

”بیچل آف آرٹس۔“

”نائس، گر بجوبیت کہو... لڑکی بھی بیچل... اپسرو۔“

”گر بجوبیت...!“ رشیدہ ٹھپر اکر بولی۔

”لپ اسٹک کبھی نہیں استعمال کرتیں یا آج ہی نہیں کی۔“

”کبھی نہیں۔“

”گلڈ...!“

پھر اس نے اپنی سیکریٹری کی طرف مز کر پوچھا۔ ”کوئی اور بھی ایسی ہے جس نے لپ اسٹک  
بھی نہیں۔“ سیکریٹری کی کمپانی ہوئی کی آواز سنائی دی۔

”سب کو رخصت کر دو۔“ وہ غرایا۔ ”اور اگر تم نے بھی اس کا استعمال ترک نہ کیا تو تمہیں  
کھر رخصت کر دیا جائے گا۔... سمجھیں۔“

”جی ہاں۔“ وہ مری ہوئی آواز میں بولی اور باہر چلی گئی۔

”ڈوکٹشن...!“ اس نے رشیدہ کی طرف کاغذ اور پنسل سر کاتے ہوئے کہا۔  
رشیدہ کا ہاتھ کا نپ رہا تھا لیکن وہ پنسل پکڑ کر بیٹھ گئی۔

تحوڑی دیر بعد وہ بول رہا تھا اور رشیدہ کا ہاتھ تیزی سے چل رہا تھا۔ اس نے ایک بار بھی سر  
الٹا کر اس کی طرف دیکھنے کی نہت نہیں کی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر ایک بار بھی اس سے نظریں چار  
ہو گئیں تو وہ جسمانی اور ذہنی دونوں حیثیتوں سے بیکار ہو جائے گی۔

”بن...!“ وہ تحوڑی دیر بعد بولا۔ ”جاوے سے ناپ کرو۔“

جیسیں ایڈ جعفری کا دفتر رحمٰن لاج کے تین چار لفڑیوں پر مشتمل تھا۔ شہر کی بڑی فرمومیں میں  
جیسیں ایڈ جعفری کا بھی شمار ہوتا تھا۔ فرم کا ایک پارٹر جعفری عی اس کا جزل نجیب بھی تو  
دوسرے ہے دار غیر ملکی تھے۔ جیسیں سب سے بڑا حصہ دار اور بالائیت کا باشندہ تھا لیکن وہ بھی یہاں نہیں  
رہتا تھا۔ اس کی یہاں کی تجارت کی دلکشی بھاں اس کا مختار مسٹر ہر شفیلڈ کرتا تھا۔ وہ بھی ہر ماہ کے  
اختام ہی پر دفتر میں آتا تھا۔ مختصر یہ کہ فرم حقیقتاً جعفری عی کی کالا کردگی کی بناء پر چل رہی تھی۔  
جعفری کے کرنے کے سامنے ایک بڑا کمرہ تھا جس میں اس کی سیکریٹری راحیلہ بیٹھتی تھی اور  
شاید بھی کمرہ ملاقاتیوں کے لئے بھی تھا۔ حالانکہ انٹر دیو کا وقت دو بجے تھا لیکن فویں بجے سے  
امیدوار آنے لگی تھیں۔ دو بجے تھے تو خاصی بھیڑ ہو گئی۔ ان میں سبھی نوجوان اور قبول صورت  
تھیں۔ جو نہیں بھی تھیں انہوں نے بنیت کی کوشش کی تھی۔ ابھی میں رشیدہ بھی نظر آری  
تھی۔ ابھی تک اس کا نمبر نہیں آیا تھا۔ انٹر دیو کے لئے اندر جانے سے پہلے ہر لڑکی اپنے پر  
سے چھوٹا سا آئینہ نکال کر اپنے بالوں اور چہرے پر تنقیدی نظریں ضرور دالتی تھی۔ بعض  
ہوئوں پر لپ اسٹک کی نتی تھہ پڑھانے لگتیں۔ رشیدہ نے اپنے پس ٹھوٹا لیکن اس میں کیا تھا اور  
اسے ایک سکھاٹک تو رکھنے نہیں دیتا تھا۔ لپ اسٹک تو خیر اس نے برسوں سے نہیں استعمال کر  
تھی۔ اور کا قول تھا کہ لپ اسٹک لگانے سے حسن کی عصمت دری ہو جاتی ہے اور چہرے  
فاشہ پن پٹکنے لگتا ہے۔ البتہ ہلکے سے پاؤڑا اور اتنے ہلکے سے روچ پر کہ سرخی قدر تی معلوم  
اے کوئی اعتراض نہیں تھا۔

ابھی کئی لڑکیاں باقی تھیں کہ سیکریٹری نے اگر رشیدہ کا ہام لایا۔  
رشیدہ لاپڑاہی سے اٹھی اور اس کے ساتھ ہوئی۔ سیکریٹری نے دروازہ کھولا اور رشیدہ  
جزل نجیب منزوں جعفری کے کرے میں داخل ہوئی۔  
دوسرے خار خوفناک آنکھیں اس کی طرف اٹھیں اور رشیدہ کا نپ گئی۔ بھاری جڑوں  
جیکھے خدا خال کا ایک ڈراؤنا آدمی اُسے گھور رہا تھا۔ اس کے شانے کافی چوڑے اور بھرے۔  
تھے۔ پیشانی اوچی اور بال مگریا لے تھے لیکن نہ جانے کیوں ان میں کوئی دلکشی نہیں تھی۔

”گز!“ اس نے گھنٹی کی طرف ہاتھ بڑھاتے بڑھاتے رک کر کہا۔ ”ایک بات اور... تم اپنے کام سے کام رکھو گی۔ وہ بات جس سے تمہیں کوئی سروکار نہ ہوا پی دچکپیوں کی لست پر نہیں لاوے گی۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔“

”آہم.... کچھ نہیں.... میں۔“ اس نے گھنٹی بجائی اور سیکریٹری پھر اندر آگئی۔

”آنہیں کام بتاؤ۔“ اس نے ایک کاغذ پر نظریں جھائے ہوئے کہا۔ سیکریٹری رشیدہ کو لے کر بڑے کرے میں چل آئی۔ اس کی آنکھیں سوچی ہوئی تھیں اور ہاں کے نتھے سرخ ہو گئے تھے۔ اس نے ایک فائل نکال کر رشیدہ کے سامنے ڈال دیا۔

”تاریخ و امار تاپ کرتی جاؤ۔ ایک ایک نقل بھی ہو گی۔“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ رشیدہ صرف اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔ ویسے وہ اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی۔ وہ فائل سے کاغذات نکال کر تاپ کرنے پڑی۔

تو گیڑی دیر بعد جعفری اپنے کرے سے نکل کر اُن کی طرف دھیان دیئے بغیر باہر چلا گیا۔ اس کے جو توں کی چڑچڑاہٹ کافی دیر تک سنائی دیتی ہی۔

رشیدہ تاپ کر رہی تھی لیکن اس کا ذہن اسی عجیب و غریب آدمی میں الجھا ہوا تھا اور اس کی سیکریٹری راحیلہ تو اس سے بھی عجیب تر معلوم ہو رہی تھی۔ یہ ایک دلیل پلی سی کافی خوبصورت لڑکی تھی۔ آنکھیں بڑی اور پلکیں گھنیری تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ہر وقت کسی انجانے نہ سے بو جھل رہتی ہوں۔ رشیدہ نے اسے آفس میں روئے دیکھا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ وہ اگر اپنے مالک کا رویہ اپنے لئے تو ہیں آمیز سمجھتی ہے تو یہاں کیوں پڑی ہوئی ہے جعفری جیسا وحشی میں آج تک اس کی نظروں سے نہیں گزر اتھا۔ اس نے اس غریب لڑکی سے کتنی بے دردی سے باتیں کی تھیں۔ شاید وہ عورت کا احترام کرنا جانتا ہی نہیں تھا۔

رشیدہ سوچتی رہی اور اس کی انگلیاں تیزی سے Key Board پر چلتی رہیں۔ اس نے یہ نکل کر محسوس کیا کہ راحیلہ اس کے قریب ہی آکر بیٹھ گئی ہے۔

”میں تمہیں کہیں اور ملازمت نہ ملتی۔“ اس نے رشیدہ کو فاطب کیا اور رشیدہ چوک پڑی۔ ”ملازمت کہاں ملتی ہے آج کل۔“ رشیدہ منہ بنا کر بولی۔

رشیدہ کرے سے چلی آئی۔ بڑے کرے میں سیکریٹری کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ وہ اپنے میز پر سر اونڈھائے بیٹھی تھی اور اس کے جسم کی متواتر جنبشوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ ”سک سک کر رہا رہی ہے۔ رشیدہ چپ چاپ بیٹھ کر تاپ کرنے لگی۔ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ فریدی نے کہاں پھنسا دیا۔

تو گیڑی دیر بعد گھنٹی بھی اور سیکریٹری اچھل کر سیدھی ہو گئی۔ اس نے جلدی جلدی اپنے آنکھیں خشک کیں لباس درست کیا اور اندر چلی گئی۔ رشیدہ نے محسوس کیا کہ اس نے اپنے ہوند صاف کر دیا ہے۔

رشیدہ تاپ کر کھینچنے کے بعد انتظار کرتی رہی۔ سیکریٹری اندر تھی۔ اس نے گھری کی طرف دیکھا وہ سوچ رہی تھی کہ کہیں وہ یہ نہ سمجھے کہ وہ اتنی دیر تک مٹول کر تاپ کرتی رہی ہے لیکن اس کی بھی بہت نہیں تھی کہ جعفری کے کمرے کا دروازہ کھلھٹا تھا۔

جیسے ہی سیکریٹری کرے سے نکلی وہ گھری ہو گئی۔ ”ہو گیا۔“ رشیدہ آہستہ سے بولی۔ سیکریٹری نے سر کو خفیف سی جنبش سے دروازے کے طرف اشارہ کیا اور اپنی میز پر بیٹھ گئی۔ رشیدہ اندر چلی گئی۔

”آہم.... سٹ ڈاؤن۔“ جعفری غریباً۔ رشیدہ نے بیٹھنے ہوئے شیٹ اس کی طرف بڑھا دی۔

”ٹھیک! پہلے کہاں کام کیا ہے۔“ ”نیا شاہ کے دفتر میں۔“ ”وہاں سے کیوں چھوڑا۔“ ”راہنمائی میں تھی۔“ ”آہم! کتنی تجوہ تھی۔“ ”ڈھائی سو۔“

”لیکن یہاں صرف دو سو میں گے۔“ ”محضے منظور ہے۔“ رشیدہ آہستہ سے بولی۔

لاشوں کا آبشار

انگلیاں Key Board پر دوڑنے لگیں راحیلہ گھبر اہٹ میں ایک فائل الٹ رہی تھی۔ جو توں کی چڑچڑاہٹ قریب ہوتی جا رہی تھی اور پھر کمرہ گو بنجئے لگا۔ جعفری دونوں کی میزوں کے درمیان آئر رک گیا۔ دونوں اس طرح کام میں مشغول نظر آرہی تھیں جیسے انہیں اس کے آنے کی اطاعت ہی نہ ہو۔ البتہ راحیلہ کانپ رہی تھی۔

”آہم....!“ جعفری غریا۔ ”غمین لورہی تھیں.... لڑکی۔“ اس نے رشیدہ کو مخاطب کیا۔ ”تم نی ہو.... لیکن.... آفس نامم میں.... صرف کام ہونا چاہئے۔“

واپسے کمرے میں چلا گیا۔ رشیدہ بد خواہی سے ناکپ کرتی رہی۔ اس کے چلے جانے کے بعد، بھی اس نے سر نہیں اٹھایا۔ اس کی آذاب تک اس کے سر میں دھمک پیدا کر رہی تھی اور راحیلہ تو بالکل چیلی پر گئی تھی۔

چار بجے پوری عمارت گھنٹیوں کی آواز سے گونج اٹھی۔ رشیدہ نے سر اٹھا کر دیکھا۔ راحیلہ فائل اٹھا کر الماری بند کر رہی تھی۔ شاید یہ کام ختم ہونے کی گھنٹی تھی۔ رشیدہ بدستور ناکپ کرتی رہی۔

”مشین بند کرو۔“ راحیلہ نے اس کے قریب آکر کہا۔  
”یہ شیٹ تو نکال لوں۔“ رشیدہ بولی۔

”نہیں گھٹی بجھے کے بعد کوئی کام نہیں کر سکتا۔“

”خیر اگر تم کچھ اور بھی سننا چاہتی ہو تو مجھے اعتراض نہیں۔“ راحیلہ نے منہ بنا کر کہا اور اپنا بینڈ بیگ اٹھانے لگی۔

”ٹھہر و۔“ رشیدہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اس نے جلدی جلدی شیٹ ناکپ رائٹر سے نکالا اور ”درے کاغذات سمیٹ کر فائل میں رکھ دیئے۔

پھر وہ دونوں آفس سے نکل آئیں۔

”تو ہم گھرے دوست ہیں۔“ رشیدہ مسکرا کر بولی۔ ”آؤ چائے بیس۔“

”چائے۔“ راحیلہ کی آواز کھوئی کھوئی سی تھی۔ ”مجھے فوراً ہی گھر پہنچنا ہوتا ہے.... مان انڈھی ہے نا۔ دوسرا بھیں بھی چھوئی ہیں۔ اگر میں تھوڑا بہت وقت تفریحات کے لئے وقف کروں تو.... مجھے دراصل یہاں سے جا کر کھانا تیار کرنا ہو گا۔“

”دو ہی تین ہفتوں میں تمہارے گالوں کی بہیاں اُبھر آئیں گی۔“

”کیوں....!“

”اوہ! کیا تم نے کچھ نہیں محسوس کیا۔“ وہ بذریعی انداز میں بولی۔ ”کیا وہ آدمی ہے درندہ...“

”وھی....!“

”لیکن.... یہی میں بھی سوچ رہی تھی کہ آخر تم....!“

”میں....!“ وہ رشیدہ کی بات کاٹ کر بولی۔ ”میں مجبور ہوں۔ میری ایک انڈھی بیوہ ماں ہے چھ بھائی بہن ہیں۔ وہ سب چھوٹے ہیں۔ اگر میں یہاں ملازمت ترک کر دوں تو ان کا کیا ہو گا۔ مجھے یہاں تین سوروں پے ملتے ہیں۔ زہر کی تین سو بوندیں، تین سو خیبر، جو چاہو سمجھ لو۔“

”یہ ہمیشہ ایسا ہی رہتا ہے۔“ رشیدہ نے پوچھا۔

”ہمیشہ.... تم ہر وقت یہی محسوس کر دیگی کہ تم پا اپک سانپ پھن اٹھائے مسلط ہے معلوم نہیں کب ڈس لے۔“

”تم یہاں کب سے ہو۔“

”ڈیڑھ سال سے.... اور یہ ڈیڑھ سال ایسے معلوم ہوئے ہیں جیسے ڈیڑھ ہزار برس گذر گئے ہوں۔“

”اس فرم کی خاص تجارت کیا ہے۔“

”ٹو ہے کاسماں، سمندر پار کی ادویات، پتھر اور بھی کچھ ایسی چیزیں جن کیلئے خاص اضاف ہے۔“

”بزرگی کا قیام کہاں ہے۔“

”خدا ہی جانے۔“

”کیوں؟“ رشیدہ کے لجھ میں حیرت تھی۔

”وہ ایک قطعی غیر سو شش آدمی ہے۔ کم از کم میں تو قطعی نہیں جانتی کہ وہ کہاں رہتا ہے اور اس کی کیا مشغولیات ہیں۔“

”بیوی بچے ہیں۔“ رشیدہ نے پوچھا۔

”بیوی بچے۔“ راحیلہ زہر خند کے ساتھ بولی۔ ”جانوروں کے بیوی بچے نہیں ہوا کرتے۔“ دو رکھیں جو توں کی چڑچڑاہٹ سنائی دی اور راحیلہ اچھل کر اپنی میز پر جا یعنی۔ رشیدہ د

”تو پھر مجھے اپنا گھر ہی دکھادو۔“

”اوہ بڑی خوشی سے۔“ راخیلہ کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ”ضرور چلو، ماں بہت خوش ہو گی یہ کوئی دوست نہیں، مجھ میں جیسی مردہ دل سے کون دوستی کرے گا۔ آج کل دوستیاں تو عموماً کلبوں، باروں اور یہ شور انوں تک محدود ہوتی ہیں۔ اوہ.....ابھی تک بس نہیں آئی۔“

”ٹیکسی سے چلیں گے۔“ رشیدہ نے لاپرواں سے کہا۔

”ٹیکسی...!“ راحیلہ نے اس طرح دہرایا جیسے رشیدہ نے ہواں جہاز کہا ہو۔

”ہاں....ہاں....میرے پاس کافی پیے ہیں۔ میں اکیلی ہی ہوں نا۔۔۔ کافی پیے پختے ہیں۔“

”تم اکیلی ہو۔“ راحیلہ اسے اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے وہ کوئی عجوبہ ہو۔

رشیدہ نے ایک ٹیکسی رکوائی اور دونوں اس میں بیٹھ گئیں۔ پھر اس نے راحیلہ سے پتہ پوچھ کر شو فر کو بتایا اور ٹیکسی چل پڑی۔ راحیلہ اب تک رشیدہ کو حیثت سے دیکھ رہی تھی۔

”تمہارا کوئی مرد دوست نہیں۔“ رشیدہ نے پوچھا۔

”نہیں کوئی نہیں۔“ راحیلہ مضطربانہ انداز میں بولی۔ ”میں نے آج تک اس کی ہمت ہی نہیں کی۔“

”کیوں؟“

”میں اپنی ہی ذات سے بڑی خائن رہتی ہوں کہ میرے ہی جذبات مجھے شکنے کی طرح نہ جانے کدھر بھالے جائیں گے پھر میری اندر ہمیں ماں کا کیا بنے گا۔ میرے نئے نئے بھائی بھن۔“ راحیلہ کی آنکھوں میں آنسو چھکت آئے تھے جنہیں وہ دوسری طرف منہ پھیر کر پینے کو کوشش کر رہی تھی۔

رشیدہ کچھ نہ بولی اور اس لڑکی کی بیچارگی پر غور کر رہی تھی۔ دونوں خاموش تھیں۔

دفعتاً راحیلہ چیخ پڑی.... وہ سامنے ہی دیکھ رہی تھی۔

ٹیکسی کے ڈرائیور کی لاپرواںی تھی یا سامنے سے آنے والی کار میں بیٹھے ہوئے آدمی کی غلطی کہ دونوں کاریں بس ایک فٹ کے فاصلے پر رک گئیں۔ بریکوں کی آواز سنائی دی اور وہ دونوں الگ شیٹ کی پشت سے نکلا گئیں۔

دوسرے لمحے میں انہوں نے غراہٹ قسم کی آواز سنی جو جزل میجر جعفری کی آواز کے علاوہ اور کسی کی نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ اپنی کار سے اتر کر سیندھا ٹینکنی کی طرف آیا کھڑکی کھولی۔“

شو فر کو گریبان سے کپڑا کر نیچے کھینچ لیا۔ اس نے ان دونوں کی طرف دھیان تک نہ دیا تھا۔ ڈرائیور کو دو تین ہاتھ جھاڑنے کے بعد وہ نہایت سکون سے اپنی کار میں جا کر بیٹھ گیا اور کار پل پڑی۔

ڈرائیور کئی منٹ تک گالیاں بکار رہا۔ ٹیکسی کے گرد اچھی خاصی بھیڑ اکٹھا ہو گئی تھی۔

”کیوں صاحب میری غلطی تھی۔“ وہ ٹیکسی میں بیٹھتا ہوا ان دونوں کی طرف مڑ کر بولا۔ ”نہیں....!“ رشیدہ نے آہستہ سے کہا۔

”خیر سالے کو پھر بکھر دیکھ لوں گا۔ اُسے بھی بیٹھنے اور مجھے بھی۔“

ٹیکسی رو انہے ہو گئی مگر ڈرائیور بدستور بڑ بڑا نے جارہا تھا وہ کچھ اس قسم کی باتیں کر رہا تھا جیسے شہر میں جتنے بھی قتل ہوتے ہیں اسی کے دم سے اور جتنی بھی بدمعاشیاں پھیلی ہوئی ہیں ان سب کا درج رو اس وہی ہے۔ دنیا میں اب تک جتنے بھی سرکش گزرے ہیں انہیں اسی نے نیچا دکھلایا تھا۔ رشیدہ اور راحیلہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبانیں پھیر رہی تھیں۔

وہ اس کے متعلق کچھ جانتے ہوں اور ان آدمیوں سے بھی واقف ہوں جنہوں نے اسے استفسر کیا تھا۔

رشیدہ چپ چاپ ان کا تعاقب کرنے لگی کیونکہ وہ ان کی حقیقت سے ناواقف تھی۔ ان میں ایک سرجنٹ حمید تھا اور دوسرا ناگر، حمید نے جان بوجھ کر یہ حرکت کی تھی۔ وہ بھی تسلیک شکاری ہی دالے بھیں میں تھا اور اس کے چہرے پر گھنی موچھیں تھیں۔ رشیدہ کو دیکھ کر اس کی رُگ شرارات پھر زک اٹھی تھی اور اس نے اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے رانفل کا تذکر چھیڑا۔ ان بھر کی کوفت کے بعد وہ تھوڑی سی تفریح بھی کرنا چاہتا تھا۔ آج وہ اور ناگر میں فون ایکچھیں کے گرد منڈلاتے رہے تھے۔ میلی فون ایکچھیں میں ابھی دن محمد سراج رسانی کے دو تین آدمی بھیثیت میلی فون آپریٹر زداخی ہوئے تھے۔ انہیں فریدی کی طرف سے ہدایت ملی تھی کہ مسٹر کیو کے پیغامات پر نظر رکھیں اور انہیں نوٹ کر کے اس تسلیک پہنچائیں۔ حمید دن بھر کی روپورٹ لے کر جاہی رہا تھا کہ رشیدہ نظر آگئی۔

حمدی اور ناگر نے ایک ریستوران کا رخ کیا۔ رشیدہ بچھے لگی رہی اور وہ ان کے قریب ہی کی ایک خالی میز پر جا پیٹھی۔ حمید اور ناگر سرگوشیوں میں گفتگو کرتے رہے۔ بظاہر وہ رشیدہ کی طرف سے لامع نظر آرہے تھے۔

رشیدہ نے کافی منگوائی لیکن اسے پیچے نہیں کہ کب ختم ہو گئی۔ وہ دراصل ان کی گفتگو سننے کی کوشش کر رہی تھی۔

اپنی چاہے ختم کرنے کے بعد حمید اور ناگر اٹھ گئے۔ رشیدہ کا شہبہ یقین کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ اس نے جلدی سے بل ادا کیا اور باہر نکل آئی۔ دونوں فٹ پا تاخ پر آہستہ چل رہے تھے۔ سڑک سے گزر کر وہ ایک لگی میں مڑ گئے۔ رشیدہ کافی فاصلہ پر ان کا تعاقب کر رہی تھی۔ نہ جانے کتنی تھی دریچے گلوں سے اسے گذرنا پڑا۔ وہ دونوں کہیں رکنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔

وہ پھر ایک تاریک لگی میں ہڑے اور رشیدہ جیسے ہی اس لگی میں داخل ہوئی اس نے محسوس کیا کہ دونوں کے قدموں کی آوازیں آئیں بند ہو گئی ہیں۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انہیں میں گھوڑ رہی تھی۔ دفعتاً کوئی محدثی سی چیز اس کی کپٹی سے آگئی۔

”خبردار۔“ ایک سرگوشی سنائی دی۔ ”آواز نکلی اور کھوپڑی صاف۔ بغیر آواز کا ریو اول۔“

”ہے... آگے چلو... چلو...!“

اب ریو اور کی تال اس کی پیٹھ پر تھی اور وہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہی تھی۔

”وابہنے مزو... چلتی رہو... ٹھیک... اب رک جاؤ۔“

تالے میں کنجی گھمانے کی آواز سنائی دی اور کوئی دروازہ چڑھاہٹ کے ساتھ کھلا۔ گلی میں عیوب طرح کی میلی سی بدبو گون خرہی تھی۔

”پلو اندر چلو... شابش۔“ سرگوشی پھر سنائی دی۔ حمید حتی الامکان اپنی آواز بدلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ رشیدہ پر لے سرے کی چالاک اور ذہین ہے اگر پہچان گئی تو ساری تفریح کر کری ہو جائے گی۔ ان کے پیچے دروازہ بند ہو گیا۔ پھر سونگ اون کرنے کی آواز آئی اور رہداری روشن ہو گئی۔ رشیدہ نے خود کو انہیں دونوں کے درمیان میں پایا۔ گھنی موچھ دالے ٹھکری کے ہاتھ میں ریو اور تھا۔

”آگے بڑھے... مختصر مدد۔“ سرجنٹ حمید نے نہایت ادب سے کہا۔

”اس کا مطلب...؟“ رشیدہ گھوڑ کر بولی۔

”اندر لغت موجود ہے۔ مجھے مطلب زبانی نہیں یاد رہا کرتے۔“

”مجھے جانے دو... درستہ سور جھاؤں گی۔“

”اوچی سے اوچی عورت سے بھی میں ہی تو قرکھتا ہوں۔“ حمید لاپرواںی سے بولا۔ ”چلتے۔“ رشیدہ بے کسی سے چلنے لگی۔ وہ ایک کمرے میں آئے جہاں کی پرانی اور زنگ خورde کر سیاں پڑی ہوئی تھیں۔

”تشریف رکھئے۔“ حمید نے ایک کری کی طرف اشارہ کیا۔ رشیدہ بیٹھ گئی۔

”مجھے یاد نہیں آ رہا ہے کہ میں آپ کو یہاں کس لئے لایا ہوں۔“ حمید نے ذہن پر زور دینے کی ایکٹک کرتے ہوئے کہا۔

”یہ کیا یہودگی ہے۔“ رشیدہ گھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

”جاوہ ایک چھراتلاش کرو۔“ حمید نے ناگر کو مخاطب کر کے کہا۔ ناگر مسکراتا ہوا چلا گیا۔

”بیٹھے بیٹھئے۔“ حمید رشیدہ کی طرف دیکھ کر خنک لبھ میں بولا۔ ”مجھے جو لڑکی پسند آتی ہے

طرح چیز چیز کر دیکھ لو کوئی جو مدد کو آئے۔ چلو تمہیں ان لڑکوں کی ہڈیاں اور کھوپڑیاں دکھاؤں  
بنہیں پہلے کھاچا ہوں۔ اے اب تو رال بھی نہیں گی۔ کہاں مر گیا۔ بھائی، اے کیا ابھی تک  
چھراہی نہیں تیز ہوا۔“

”خدا کے لئے مجھے جانے دو۔“

”سیا متم نہیں چاہتیں کہ میں تمہیں کھا جاؤں۔“

”نہیں...!“ رشیدہ بوکھلا کر بولی۔

”اگر میں تمہیں چھوڑ دوں تو مجھے یاد رکھو گی۔“

”ہاں...!“ رشیدہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے اور کیا سن رہی ہے۔

”تمہارا نام کیا ہے۔“

”رشیدہ...!“

”تب تو میں تمہیں ہر گز نہ چھوڑوں گا۔“

”کیوں...?“

”رشیدہ جو نام ہے تمہارا۔ ہر وہ نام مجھے بہت پیدا اللاتا ہے جس میں شین ہو رشیدہ... ہائے۔“

”وہ تھوڑی دیر تک خاموش رہا پھر ہاٹک لگائی۔“ ابے تیز ہو گیا چھرا۔

”تیز کر رہا ہوں۔“ کسی دوسرے کمرے سے آواز آئی۔

”جلدی کزو۔“

”نہیں... نہیں...!“ رشیدہ گھصایا۔

”اے... واہ... یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ سب سے پہلے تمہارے ہونٹ کاٹوں گا پھر  
گالوں کا گوشت اتاروں گا... ہائے ہائے۔“

”وہ کسی ندیدے آدمی کی طرح منہ چلانے لگا۔

”بچاؤ... بچاؤ۔“ رشیدہ زور سے چینی۔

جمید ہنسنے لگا۔ دور کہیں بھاری قد موس کی آوازیں سنائی دیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی  
جلدی جلدی زینے طے کر رہا ہو۔

”چپ رہو... چپ رہو۔“ جمید دھیرے سے بولا۔ ”میرا باپ آرہا ہے۔“

اے میں اپنی پہلی فرصت میں ذبح کر دالتا ہوں۔“

رشیدہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔

”اس نے ذبح کر دالتا ہوں کہ وہ کسی اور کوئی نہ پسند آجائے۔“ حمید نے پھر کہا۔

”یکو نہیں! مجھے جانے دو۔“ رشیدہ جی کڑا کر کے بولی۔

”افسوس!“ حمید مغموم آواز میں بولا۔ ”میں سمجھا تھا کہ تم پہلی ہی نظر میں مجھ پر عائز  
ہو گئی ہو گی۔“

رشیدہ کی آنکھیں حرمت سے پھیل گئیں۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کہیں وہ کسی پاگل کے ہمچہ؛  
نہیں چڑھ گئی۔ اتنے میں ناگر ایک بڑا سا چھرا لے کر آگیا۔ حمید نے ہاتھ میں لے کر اس کی دھنڑ  
دیکھی پھر بگڑ کر بولا۔

”اس سے تو موم کی عورت بھی نہ ذبح ہو گی۔ جا کر تیز کرو۔“

ناگر چھرا لے کر پھر چلا گیا۔

”جب سے تمہیں دیکھا ہے۔“ حمید سینے پر ہاتھ رکھ کر ٹھیٹھے عشقیہ انداز میں بولا۔ ”ول کبھی  
نیچے کبھی اوپر... تمہارا خون کتنا لذیذ ہو گا۔ اور تمہاری بوٹیاں... ہائے... ہائے... بغیر  
رشیش کا گوشت... ہو لے ہو لے احتیاط سے چباوں گا۔ بوٹیاں دانتوں کے نیچے پھسلیں گی...  
ہائے... ہائے۔“

وہاں پہلی کرز دوزر سے نیسہ پٹیئے لگا۔

رشیدہ کا پعنے لگی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندر ہیر الہ انسانے لگا۔

”سنتی ہو۔“ حمید نے پھر ہاٹک لگائی۔ ”تمہاری انگلیوں کی ہڈیاں... ریلی ہڈیاں... گزر  
گزر چباوں گا۔“

رشیدہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر

یہ پاگل ہے تو ان کا ساتھی تو پاگل نہیں ہو سکتا۔ کس و بال میں پھنس گئی۔

”ڈر نہیں بھی۔“ حمید بچوں کی طرح ٹھنک کر بولا۔ ”ڈر کر تم سارا مزہ کر کر اکر ڈو گی۔“

”مجھے جانے دو۔“ رشیدہ گھٹی گھٹی سی آواز میں چینی۔

”اس مکان کی دیواریں خاص طور سے بنائی گئی ہیں۔“ وہ پر سکون لجھ میں بولا۔ ”تم اچی

"چھاؤ...!" رشیدہ پھر چھنی۔

"عجیب الحق لڑکی ہو۔ خدا غارت کرے تمہیں۔ سارا مزہ کر کر اکر دیا۔"

قدموں کی آوازیں نزدیک ہوتی جا رہی تھیں۔ پھر ایک دروازہ کھلا اور رشیدہ کو اسکپل فریز دکھانی دیا۔ وہ چھ کر اس کی طرف چھٹی اور قریب قریب اس پر گر پڑی۔

"پچائے! پچائے مجھے اس پاگل سے۔"

"پاگل....!" فریدی کے لجھ میں حیرت تھی۔

"جی ہاں... پس پاگل... مجھے ذمکر کرنا چاہتا تھا... چھرا... چھرا... تیز ہو رہا ہے۔"

"سمجھا! نہہر و کھاں چلے۔" فریدی نے حمید کو لکارا۔

حمید رک گیا۔

"یہ کیا حرکت تھی۔" فریدی اُسے گھوڑتا ہوا بولا۔ رشیدہ سید ہی کھڑی ہو گئی تھی حیرت سے کبھی حمید کی طرف دیکھتی تھی اور کبھی فریدی کی طرف۔

"حمدی! میں تم سے حق حجج نہ گی آگیا ہوں۔"

"حمدی....!" رشیدہ نے آہستہ سے دہر لیا اور اس نے ہونٹ بھینچ لئے۔ وہ آہستہ آہستہ حمید کی طرف بڑھی اور پھر اچھل کر اس کے بال مٹھی میں جکڑ لئے دوسرے لمحے میں وہ اسے ایسے صوفے پر گرائے اس پر چڑھی بیٹھی گھونسوں اور چپڑوں کی بیداری کر رہی تھی۔ فریدی بے تھاش پنس رہا تھا اور حمید نہ تو وہ بھی رہا تھا لیکن رشیدہ کی چلکیوں اور بکوٹوں کی وجہ سے اس کی بندی میں کراہیں اور چینیں بھی شامل ہو گئی تھیں۔ بدقت تمام فریدی نے انہیں الگ کیا۔ اس دوران ناہر بھی آگیا تھا اور اس کے ہاتھ میں ابھی تک چھرا دبا ہوا تھا۔

"اُبھی تک میرا دل نہیں بھرا۔" رشیدہ ہانپتی ہوئی بولی۔

"اور ابھی میری تحکم بھی دور نہیں ہوئی۔ انور واقعی براخوش قسمت ہے۔"

"بے حیا۔" رشیدہ نے بھنا کر کہا۔

"کسی عورت کے ہاتھ سے پٹنے میں بڑی لذت پائی جاتی ہے۔"

"اچھا تو نہہر و۔" رشیدہ پھر بڑھی لیکن فریدی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر حمید سے کہا۔ "اب شپیوں گا تمہیں۔"

"خدا کی صنم بڑی کوفت ہو گی مجھے۔" حمید ڈھٹائی سے بولا اور ہستا ہوا کمرے سے چلا گیا۔

"تم کیسے پھنس گئیں اس کے چکر میں۔" فریدی نے پوچھا۔  
رشیدہ نے سارے واقعات دہرا دیئے۔

"عاجز ہوں اس سورے۔" فریدی نے کہا۔

"خیر میں بھی کسی موقعے سے وہ متھے چکھاؤں گی کہ یاد ہی کرے گا۔"

"بھی ابھی نہیں... بہت کام کرتا ہے۔"

"میں نے جیسے اینڈ جعفری میں ملازمت کر لی ہے۔"

"بہت خوب۔ جعفری کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کرو اور ادھر ادھر بھی نظر رکھنا۔"

"میاں کا تعلق اسی رائقنے...!"

"ہاں... ہاں... لیکن کسی کام میں جلدی کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"وہ بڑا خوفناک اور پر لے سرے کا وحشی ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔" فریدی بُرخی خیال انداز میں سر ہلا کر بولا۔ "تمہیں میری طرف سے براہ راست ملتی رہیں گے۔ جب ضرورت سمجھوں گا تو انور کو بھی شریک کرلوں گا ویسے اس کا خیال کیا ہے۔"

"کچھ بھی نہیں اود کہتا ہے کہ ابھی تک میں کچھ سمجھ ہی نہیں سکا۔"

"معاملہ ہی ایسا ہے۔" فریدی نے سگار سلاکتے ہوئے کہا۔ "تم نے اپنا صحیح نام ہی بتایا تھلا۔"

"جی ہاں۔"

"ٹھیک ہے! میں سوچ رہا تھا کہ کہیں تم غلط نام نہ بتاؤ۔ اس طرح اسے شبہ ہو جاتا۔"

"تو کیا اس طرح شبہ نہ ہو گا۔" رشیدہ نے کہا۔ "شہر کے سارے جرام پیشہ قریب قریب

میرے اور انور کے نام سے تواقف ہی ہیں۔"

"فلک مرت کرو۔ تم وہاں اکیلی نہیں ہو۔" فریدی بولا۔ پھر اس نے حمید کو آواز دی۔

حمدید دانتوں میں پاپ دبائے ہوئے اس شان سے داخل ہوا جیسے کچھ دیر قبل اس نے کوئی

بہت بڑا منصر کہ سرانجام دیا ہو۔ رشیدہ کو بھی بھی آہی گئی۔

"رشیدہ کو گلی کے موڑ تک پہنچا آؤ۔" فریدی نے کہا۔

"میں خود چلی جاؤں گی۔" رشیدہ دروازے کی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔

”ابسا بھی کیا۔“ حمید اس کے پیچھے چل پڑا۔ ناگر بھی اس کے ساتھ تھا۔ رشیدہ کو پہنچا کر دنوں لوٹے۔

فریدی کرنے میں ان کا انتظار کر رہا تھا۔ حمید کو دیکھتے ہی برس پڑا۔ ”نہ موقع دیکھتے ہونہ محل! آخر سے بیہاں لانے کی کیا ضرورت تھی۔ گدھے کہیں کے شرم نہیں آئی پہنچتے ہوئے۔“

”آپ کو آگئی... سیکی کافی ہے۔ میں اور آپ الگ ٹھوڑا ہی ہیں۔“ حمید جیب سے دن بھر کی روپورٹ نکالتا ہوا بولا۔ ”مسٹر کو کے نام کی پیغامات تھے۔ نمبر انہیں ملک نمبر ۲..... نہیں ملا۔..... بہر حال دن میں تقریباً پچاس آدمیوں نے ”نہیں ملا“ کی ہائک لگائی۔ سہوں نے پیک ٹیلی فون بو تھا استعمال کئے تھے۔ پیغام نمبر ۵۳۔ سب ٹھیک ہے۔ نمبر ۵۴..... دیکھ لیا جائے گا۔ نمبر ۵۵ انتظار ہو گیا۔ نمبر ۶..... آج رات کو۔ نمبر ۷..... بغلہ خالی ہے! کوئی یا شیرجہ بھی نہیں رکھا گیا۔“

”آخری پیغام...!“ فریدی پر خیال انداز میں بولا۔ ” غالباً ذاکرٹر نارنگ کے متعلق ہے۔ اودہ ٹھیک بیاد آیا۔ یہ تو بھول ہی گیا تھا۔“ حمید نے کہا۔ ”آج تین بجے شام کو کسی نے ذاکرٹر نارنگ پر بھی حملہ کیا تھا۔... حملہ آور پکڑا نہیں گیا۔“

”کہاں... کتن طرح۔“ فریدی چوک کر تجوہ میں۔ ”بیچ بازار میں... میں روڈ پر... وہ کار میں جا رہا تھا کہ کسی نے گولی چلائی لیکن وہ نجی گیا۔ شیشے کے کچھ ٹکڑے اس کے جسم پر لگے ہیں۔“

”اوہ...!“ فریدی کی پیشانی پر شکنیں اُنہر آئی تھیں۔ ”رمیش! جیون اور اختر!“ حمید بولا۔ ”جیس ایڈ جعفری کے ذفتر کی نگرانی کر رہے ہیں۔ د آخر انہیں وہاں کیوں لگایا گیا ہے۔ کیا وہی مسٹر کیوں ہو سکتا ہے۔ جعفری ہے تو خوفناک۔ رشیدہ وہاں کیا کرے گی۔“

”دیکھتے جاؤ۔“ فریدی نے کہا اور پھر کسی سوچ میں ڈوب گیا۔

## ڈکٹا فون

مسٹر کیوں کا مسئلہ بھی تک فریدی اور حمید ہی تک محدود تھا یا پھر خود اسی کے گروہ والے اس نام سے واقع تھے۔ رشیدہ تک کو فریدی نے اس کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا اور اس کا محکمہ تو خیر انہیں میں تھا ہی۔ اس بدل بھی اس نے حسب عادت مجھے کوپنی مشغولیات کی باقاعدہ روپورٹ نہیں دی تھی۔ ڈی۔ آئی۔ جی۔ تک کو اس کا علم نہیں تھا کہ فریدی کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔ فریدی نے اپنے ماتحتوں میں سے پانچ چھ خاص قسم کے آدمیوں کو مختلف کاموں پر لگا کر تھا تھا لیکن ”بھی یہ نہیں جانتے تھے کہ انہیں ہدایات کہاں سے مل رہی ہیں۔“

بہر حال مسٹر کیوں کا نام تاریکی ہی میں رہتا اگر واقعات نے دوسری رانج اختیار نہ کر لیا ہوتا اور شاید اس واقعے کا ذمہ دار بھی فریدی ہی تھا کہ مسٹر کیوں کو خود ہی اپنا نام ظاہر کر دینا پڑا۔ فریدی کو پہلے سے علم تھا کہ اس نام کو یکرٹ سروٹ کے بعض ممبر استعمال کرتے رہے ہیں۔ لہذا حمید اور تارگ کے تجربات سامنے رکھ کر اس نے اس کے متعلق تفتیش شروع کر دی۔ ہو سکتا ہے کہ مجرم اس سے واقع ہو گیا ہو اور اس نے اب کسی قسم کی پر وہ داری مناسب نہ سمجھی ہے۔

تارگ کی مصنوعی خود کشی والے دن کے بعد سے میں فون ایچیجن میں مسٹر کیوں کے نام کے پیغامات موصول ہونے بند ہو گئے تھے۔

جس دن تارگ کی مصنوعی خود کشی منظر عام پر آئی اسی دن ذاکرٹر نارنگ ایم۔ پی پر حملہ کیا گیا۔ لیکن وہ بال نجی گیا۔ اسی رات کو ایک دوسرا حادثہ ہوا۔ وہ بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے معنوی نہیں تھا۔ ذاکرٹر نارنگ ہی کے گرد پ کے دوپار لینیٹری ممبر اپنی قیام گاہوں پر قتل کر دیئے گئے۔ دوسری صبح کو ان کے سر جسموں سے الگ پائے گئے اور انتہائی کوششوں کے باوجود بھی اس قسم کے نشانات نہ مل سکے جن سے قاتلوں پر روشنی پڑتی۔

تو عوام میں خوف کی لہر دوڑ گئی تھی اور خواص کو توہر لحظہ ملک الموت کی جھلکیاں دکھائی دیتی تھیں۔ پہلے وزیر خزانہ انتہائی پر اسرار طریقے پر قتل ہوئے پھر ذاکرٹر نارنگ پر شہر کی سب سے بھرپوری پری سڑک پر اعلانیہ حملہ کیا گیا اور اسی رات کو پارلیمنٹ کے دو اور ممبر قتل کر دیئے گئے لہذا خواص کی سراسی میگی لازمی تھی۔

مکملہ سراغ رسانی کی عمارت میں تو گویا زرلہ آگیا تھا۔ آئی۔ جی سے لے کر معمولی  
لباس والے تک بوکھلا ہٹوں کا شکار نظر آرہے تھے۔ سارا عملہ اج پھر بڑے کمرے میں اکٹھا تھا  
البته فریدی اور حمید موجود نہ تھے اور وہ پانچ مخصوص سادہ لباس والے بھی نہیں تھے جنہیں فریدی  
نے خود ٹرینگ دی تھی۔

ڈی۔ آئی۔ جی اور آئی۔ جی میں کسی خاص مسئلے پر بحث ہو رہی تھی، ایک کلرک نے اُر  
ڈی۔ آئی۔ جی کو مطلع کیا کہ اس کی فون کال ہے۔

ڈی۔ آئی۔ جی اٹھ کر چلا گیا تقریباً تین منٹ تک خاموشی رہی پھر ڈی۔ آئی۔ جی کی واپسی  
پر ایک انپکٹر نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے روک دیا۔  
”ڈاکٹر نارنگ ایم پی کا فون تھا۔“ اُس نے آئی۔ جی سے کہا۔ ”کوئی خاص بات معلوم ہوتی  
ہے۔ مجھے بلایا ہے۔ آواز سے خوفزدہ معلوم ہوتے تھے۔“

”میرا خیال تو یہ ہے کہ اب یہ سب اپنی حفاظت کیلئے آدمی بھی باگلیں گے۔“ آئی۔ جی بولا۔  
ڈی۔ آئی۔ جی چند لمحے بیٹھا کچھ سوچتا رہا پھر کمرے سے باہر چلا گیا۔  
ڈاکٹر نارنگ اپنی شہری قیام گاہ کے کمرے میں بے چینی سے ٹھہل رہا تھا جیسے ہی ایک نوکر نے  
ڈی۔ آئی۔ جی کا ملا تھا کا رڈ لا کر دیا وہ خود ہی صدر دروازے تک دوڑا چلا گیا۔

”اوہ.... آپ آگئے شکریہ۔“ وہ ڈی۔ آئی۔ جی سے مصافحہ کرتے ہوئے مضطربانہ انداز میں  
بولا۔ ”چلے.... اندر چلے... اوہ! میں اس تکلیف دہی کے لئے شرمند ہوں۔ میں خود بھی....  
آپ تک پہنچ سکتا تھا مگر....؟“

وہ اُسے نشست کے کمرے میں لے آیا۔

”بیٹھئے! بیٹھئے۔ آپ جانتے ہیں کہ پرسوں مجھ پر حملہ ہو چکا ہے اور رات کو میرے دے  
ساتھی....!“ ڈاکٹر نارنگ تحکوک نگل کر رہ گیا۔ پھر ہٹوں پر زبان پھیرتا ہوا بولا۔ وزیر خزانہ  
بھی میرے گھرے دوستوں میں سے تھے۔ میں کچھ سمجھ نہیں سکتا۔ میری.... ہم لوگوں کی پالیسی  
سے تو پورا ملک واقف ہے....!“

”جی ہاں۔“ ڈی۔ آئی۔ جی سر ہلا کر بولا۔ ”یہی توباعث حرمت ہے ہمارے کے سارے  
مخلص اور بے ضر محبت وطن تھے۔“

”اور اب.... ایک ایسی بات ہوئی ہے۔“ ڈاکٹر نے خوف زدہ انداز میں چاروں طرف دیکھتے  
ہوئے کہا۔ پھر مضطربانہ اٹھا اور دروازے تک گیا۔ ایک لمحہ ادھر ادھر دیکھتا رہا اور لوٹ کر آہستہ  
ہے بولا۔ ”آج صحیح مجھے ایک دھمکی آمیز خط ملا ہے کسی نامعلوم آدمی کی طرف سے۔“

اس نے اپنے کوٹ کی اندر ورنی جیب سے ایک لفافہ نکال کر ڈھونڈ دیا۔ آئی۔ جی کی طرف بڑھا دیا۔  
ڈی۔ آئی۔ جی لفافے سے خط نکال کر پڑھنے لگا۔ معمولی کاغذ پر تائپ کیا ہوا تھا۔

”ڈاکٹر نارنگ ایم پی.... خوش قسم تھے کہ کل نجی گئے۔ بہر حال  
تمہیں حکم دیا جاتا ہے کہ اپنادی ہی بجلد ایک ماہ کے لئے بالکل خالی کر دو۔  
اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تمہارا بھی وہی انجام ہو گا جو وزیر خزانہ اور تمہارے  
دو ساتھیوں کا ہو چکا ہے۔ اگر تم اسے محض دھمکی سمجھو تو یہ تمہاری بھول  
ہو گی۔ اس سلسلے میں پولیس سے مدد لینا واقعہ کی برپا دادی کے علاوہ اور کچھ  
نہ ہو گا۔ وزیر خزانہ کی موت ہزاروں کے مجمع میں ہوئی تھی تمہارے  
دونوں ساتھی بھرے پورے گھروں مبارکہ لگے لیکن کسی کو کاونوں  
کان خبر نہ ہوئی۔ کافی عقل مند آدمی ہو۔ اس لئے توقع ہے کہ حکم کے  
خلاف نہ کرو گے۔ فقط

مشتری کیو۔“

”مشتری کیو!“ ڈی۔ آئی۔ جی آہستہ سے بڑھا گیا اور جواب طلب نظر وہ ڈاکٹر نارنگ کی  
طرف دیکھنے لگا۔

”اب بتائیے میں کیا کروں۔“

”آپ کی حفاظت کا انتظام کیا جائے گا مگر یہ مشتری کیو۔“

”میں نہیں جانتا یہ کون ہے۔“ ڈاکٹر نارنگ نے بے چینی سے کہا۔ ”لیکن کیا آپ کے  
حاظتی اقدامات مجھے بچا سکیں گے۔“

ڈی۔ آئی۔ جی کے چہرے پر گھرے نکل کے آثار تھے۔ وہ تھوڑی دیر بعد بولا۔

”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کسی نے آپ سے مذاق کیا ہو۔“

”مذاق! مجھ سے کون.... مذاق کرے گا۔ شاید آپ بھول رہے ہیں کہ پرسوں مجھ پر حملہ

آئی۔ جی پھر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اردنی نے چق بٹا کر آپریشن روم کے انچارج کی آمد کی اطلاع دی۔

”بلاو...!“ آئی۔ جی بولا۔

آنے والے نے ایک کاغذ بڑھاتے ہوئے ڈی۔ آئی۔ جی سے کہا۔ ”آپ کے نام ٹرانسیمیٹر پر یہ پیغام موصول ہوا ہے۔“

ڈی۔ آئی۔ جی نے کاغذ لے لیا۔ یہ پیغام مخفی اشاراتی الفاظ (Code Words) میں تھا۔ دفعہ ڈی۔ آئی۔ جی کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چک پیدا ہوئی اور وہ دبے ہوئے جوش کے ساتھ بولا۔

”دیکھا آپ نے! ہمیں مسٹر کیو کے متعلق آج ہی معلوم ہوا ہے لیکن فریدی پہلے سے جانتا تھا۔“

”یعنی....؟“

”سنئے!“ ڈی۔ آئی۔ جی کاغذ پر نظریں جھائے ہوئے بولا۔ ”جب والا مجھے معلوم ہوا ہے کہ مسٹر کیو نے خود ہی اپنے کو ظاہر کر دیا اور یہ بات بھی آپ سے پو شیدہ نہ ہو گی کہ یہ نام سیکرٹ سروس کے پانچ ممبر ان استعمال کرتے تھے۔ جب مجھے پہلی بار مجرم مسٹر کیو کے نام سے آگاہی ہوئی تو میں بنے سیکرٹ سروس والوں کی تلاش شروع کر دی میں نے ان کے ٹھکانے کا پتہ لگالیا ہے۔ لیکن وہ خود نہیں ملے اور نہ ان کے ٹرانسیمیٹر ہی کا سراغ مل سکا۔ ٹیلی فون ایکچھی میں بھی پرسوں رات سے اب تک مسٹر کیو کے نام کوئی پیغام نہیں موصول ہوا۔ حالانکہ پچھلاری کارڈ تاتا ہے کہ ہر گھنٹے میں آٹھ دن پیغامات اس کے نام ضرور ہوتے تھے۔ آپ اس سلسلے میں سیکرٹ سروس کے ہیڈ کوارٹر سے گفت و شنید کچھ۔ دیسے میں تو یہی کچھ پر مجبور ہوں کہ وہ پانچوں عرصہ ہوا ٹھکانے لگادیے گئے۔“

ڈی۔ آئی۔ جی خاموش ہو کر فخر یہ انداز میں آئی۔ جی کی طرف دیکھنے لگا۔

”ہوں...!“ آئی۔ جی نے اپنے ہونٹ بھینچ لئے اور اس طرح اپنے جو توں کی طرف دیکھنے لگا جیسے ان سے جواب طلب کر رہا ہو۔

”تو کوئی سیکرٹ سروس والوں کی آڑ میں یہ سب کچھ کر رہا ہے۔“ آئی۔ جی تھوڑی دیر بعد بولا۔

بھی ہو چکا ہے۔“

”تو سنئے! میں آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ چپ چاپ بغلہ خالی کر دیجئے۔ کیا وہاں آپ سے ملازم میں ہیں؟“

”جی ہاں!“

”تو انہیں وہاں سے ہناد بھجئے۔ بقیہ ہم دیکھ لیں گے اور آپ زیادہ تر گھر ہی رہیں تو ہتر ہے۔“

ڈی۔ آئی۔ جی تھوڑی دیر تک اسے تسلیاں دیتا رہا پھر وہ خط اس سے لے کر واپس آگیا۔

آئی۔ جی اس کا منتظر تھا۔ وہ دونوں اپنے مخصوص ریلائنز روم میں چلے آئے۔

ان دونوں کے درمیان مسٹر کیو کی شخصیت زیر بحث تھی۔

”جہاں تک میرے علم میں ہے۔“ ڈی۔ آئی۔ جی کہہ رہا تھا۔ ”یہ نام سیکرٹ سروس والے استعمال کرتے ہیں اور اس کا علم میرے محلے میں فریدی کو ہو تو ہو اور کسی کو نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہی ایسا ہے جو متعلق اور غیر متعلق ہربات پر نظر رکھتا ہے۔“

”لیکن سیکرٹ سروس والے....!“ آئی۔ جی کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”اسی الگھن میں بڑی دیر سے بتلا ہوں۔“ ڈی۔ آئی۔ جی بولا۔

”آخر یہ فریدی روپرٹ کیوں نہیں دے رہا ہے۔“ آئی۔ جی کے لمحے میں جلاہٹ تھی۔

”کہی نہیں دیتا اور میرے خیال سے اچھا ہی کرتا ہے۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے کہا۔ ”خصوصاً یہ معاملہ تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے جس میں انتہائی ازاد داری سے کام لیا جائے۔“

”میں اسے درست نہیں سمجھتا۔ روپرٹ تو اسے دینی ہی چاہئے۔“

”کون سمجھائے اُسے! زیادہ کہتے تو اس تعریفی تیار ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ مخفی فطری میلان کی بناء پر ملکے میں آیا ہے۔ ورنہ خاندانی دولت اتنی کیشر رکھتا ہے جو کئی پشتوں کے لئے کافی ہو سکتی ہے۔“

”کچھ بھی ہواتی خود سری نہیں برداشت کی جاسکتی۔“ آئی۔ جی کی آواز غصے میں کانپ رہی تھی۔

ڈی۔ آئی۔ جی کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔ ”وہ جب بھی اس طرح غائب ہوا ہے کچھ نہ کر کے ہی واپس آیا ہے۔ گارس اسی والے کیس کو لیجئے۔“

”آپ خواہ مخواہ اس کی طرف داری کر رہے ہیں۔“ آئی۔ جی بگڑ کر بولا۔

ڈی۔ آئی۔ جی کچھ نہ بولا لیکن اس کا چہرہ بھی غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔

”اس کے علاوہ اور کیا سوچا جا سکتا ہے۔“  
”پھر کیا کیا جائے۔“

”میرے خیال سے سیکرٹ سروس والوں کے ہینڈ کوارٹر سے تحقیق ضروری ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ آئی۔ جی نے کہا اور میز پر رکھی ہوئی گھنٹی بجائی۔ چپ اسی اندر داخل ہوا۔

”آپریشن روم کے انچارج کو سلام دو۔“ آئی جی نے کہا۔

”خوبڑی دیر بعد انچارج آگیا۔“

”یہ بیغام...!“ آئی۔ جی کا غصہ اس کی طرف بڑھاتا ہوا ”سیکرٹ سروس کے ہینڈ کوارٹر کے

لئے جواب فوراً چاہئے۔“

آپریشن روم کے انچارج کے جانے کے فوراً بعد کمی منٹ تک خاموشی رہی پھر ڈی آئی جی بولا۔

”میرا خیال ہے کہ فریدی کسی سیدھے ہی راستے پر لگ گیا ہے۔“

”لیکن مجھے اس کا یہ روایہ قطعی پسند نہیں۔“ آئی۔ جی نے تلخ لبجھ میں کہا۔ ”ضروری نہیں

کہ وہ ہر معاملے میں داشت مند ہی ثابت ہو۔ اسے دوسروں سے بھی مشورہ کرنا چاہئے۔“

”ڈی۔ آئی۔ جی شاید بات بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے چند لمحے خاموش رہ کر بولا۔“

”بات تو ٹھیک ہی ہے! اگر ہماری لا علمی میں کسی مصیبت میں پھنس گیا تو ہمیں اطلاع نکلنے

ہوگی۔ خیر اگر مل گیا تو میں سمجھانے کی کوشش کروں گا۔“

”سمجھاؤ نہیں بلکہ مجبور کرو۔“

”ہتر ہے۔“

”وہ دونوں پھر خاموش ہو گئے۔ دونوں کے چہرے گھرے تفکر کا پتہ دے رہے تھے۔ دفاتر

ڈی۔ آئی۔ جی چوک کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔

”یہ آواز کیسی تھی۔“ وہ آہستہ آہستہ بڑھا لیا۔

”آواز کہاں...!“

”کچھ کھر کھر رہی تھی۔“

آئی۔ جی ہٹنے لگا۔ پھر سخیدہ ہو کر بولا۔ ”واقعی ہم لوگوں کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں رہی۔

غالباً اس الماری میں کوئی چوجا ہے۔“

لاشوں کا آبشار

”پوہاودہ دیکھنے! سننے! یہ آواز کچھ ایسی ہی ہے جیسی مانیکر و فون میں ہاتھ لگنے کی دوسری چیز کی رگڑ سے پیدا ہوتی ہے۔“

”آئی۔ جی غور سے سننے لگا پھر سر ہلا کر ڈی۔ آئی۔ جی کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔ ”ہے تو۔“

”آئی۔ جی نے الماری کھول کر دیکھا۔ وہاں کتابوں کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا لیکن آوازِ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد برابر سنائی دیتی رہی۔ دفتار اس نے الماری کے پیچے جھانک کر دیکھا اور اس کے منہ سے ایک تحریر آئیزی آواز نکل گئی۔“

”ڈکٹافون سے...!“ وہ آئی۔ جی کی طرف بڑھ کر بولا۔ ”یہاں ڈکٹافون کا کیا کام۔“

”دونوں خاموشی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ آئی۔ جی نے آپریشن روم کے انچارج کو پھر بولایا۔ لیکن اس نے بتایا کہ مجھے کے سارے ڈکٹافون آپریشن روم ہی میں موجود ہیں اور اس کر کے میں تو بھی کوئی ڈکٹافون لایا ہی نہیں گیا۔“

”تو اس کا یہ مطلب ہے کہ کوئی ہماری گفتگو سفارتا ہے۔“ آئی۔ جی نے کہا۔

”اس انکشاف پر مجھے کی عمارت کو ایک دوسرے زندگی سے دوچار ہونا پڑا۔ سارے کمرے چھان مارنے کے اور نتیجے کے طور پر پانچ عدد سو اور بھی برا آمد ہوئے۔“

”لیکن ان کا سلسلہ کہاں سے تھا۔ تھوڑی دیر بعد ایک انپیٹر نے اس کا بھی پتہ لگایا۔ میں فوراً“

کے تاروں پر لپٹے ہوئے باریک باریک تار دکھائی دیئے جن کا سلسلہ دوسرے کھبے تک جا بکر ختم ہو گیا تھا اور وہیں سے تار پیچے کی طرف لائے گئے تھے۔ دوسرا کھبمہ دراصل مہندی کی ایک بے ترتیب باڑھ کے بڑے میان میں تھا اور اس کی بے مرمت شاخیں کافی اوپنچائی تک پھیلی ہوئی تھیں۔

”اُنے ان تاروں کا آسمانی سے دیکھ لیا جاتا تقریباً ممکن ہی سا تھا۔“

”پھر مہندی کی باڑھ سے ملی ہوئی مالتی کی جھاڑیوں میں ڈکٹافون کار سیوینگ سیٹ بھی مل گیا۔“

”اس کی علاش کے سلسلے میں کافی ہنگامہ برپا ہو گیا تھا اور ڈی۔ آئی۔ جی سوچ رہا تھا کہ ان سے ایک ہالیاں غلطی سرزد ہو گئی ہے۔“

”ہم سے غلطی ہوئی۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے کہا۔ ”اب اس آدمی کا پتہ چنان شوار ہے جو انہیں استعمال کرتا ہے۔“

”ایک آلمہ ساعت جو دوسروں کی لا علمی میں ان کی پوشیدہ گفتگو سننے کے لئے استعمال کیا ہے۔“

”غلطی توچ بجھوئی۔“ آئی۔ جی مصلح آواز میں بولا۔  
”اگر فریدی ہوتا...!“

آئی۔ جی کے حلق سے نکلنے والی غصیل آواز نے ڈی۔ آئی۔ جی کو جلد مکمل نہ کرنے دیا۔  
”میا ہوتا۔“ آئی۔ جی چیخ جلا کر کہہ رہا تھا۔ ”تم لوگوں نے اسے فوق البشر کا درجہ دے رکھا  
ہے اور اسی لئے اس کا دماغ عرش پر رہتا ہے۔“

ڈی۔ آئی۔ جی خون کے گھونٹ پی کر زہ گیا۔ اس نے تھیہ کر لیا کہ وہ اب پچھے بولے گا ہی نہیں۔  
پچھے دیر بعد وہ پھر اسی کمرے میں آبیٹھے جہاں ڈکٹافون کا پہلا پیٹ ملا تھا۔ وہ دونوں خاموش  
ہی تھے اور ان کے چہروں پر ناگواری کے اثرات پائے جا رہے تھے۔  
آپریشن روم کے انجارج کے قدموں کی آہت نے خاموش کا ٹلسٹم توڑ دیا۔ وہ آئی۔ جی کے  
سامنے ایک کاغذ رکھ کر واپس چلا گیا۔

یہ سکرٹ سروس کے ہدیہ کوارٹروالوں کی روپورٹ تھی جو ٹھیکنگ پر موصول ہوئی تھی۔  
آئی۔ جی پڑھنے لگا۔

”یاد چھوں آدمی کام کر رہے ہیں۔“ تین دن قبل ان کی تھیو ہیں ادا کی گئی ہیں۔ ان کی جانے  
رہائش کے متعلق کسی کو کوئی علم نہیں۔ جب ضرورت محسوس ہوگی ان سے معلوم کر لی جائے  
گی۔ لیکن اس کے لیے بھی اوپر سے آئے ہوئے احکامات ہی کار آمد ثابت ہو سکیں گے۔“

آئی۔ جی تھوڑی دیر تک خاموش رہا پھر سر ہلا کر بولا۔

”عجیب بات ہے۔“

”ہے تو عجیب ہی۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے کہا۔ اس کے انداز سے معلوم ہو رہا تھا کہ اب وہ اس  
موضوع پر گفتگو نہیں کرنا چاہتا لیکن وہ حقیقت فریدی کے اس خیال سے متفق تھا کہ سکرٹ سروس والے  
بھی اڑا لے گئے اور اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ ڈاکٹر نارنگ کے دیہی بیتلکی کی خفیہ نگرانی شروع کراوے۔

## سعی لا حاصل

ایک دن رشیدہ بہت سویرے آفس پہنچ گئی۔ لیکن یہ محض اتفاق نہیں تھا بلکہ اس نے دیا

دانستہ اپسیا کیا تھا۔ تین چار دنوں کے دوران اس نے تجسس اینڈ جعفری فرم کے متعلق بہت کچھ  
معلوم کر لیا تھا اور جعفری کے سلسلے میں یہ بات خاص طور سے بتوث کی تھی کہ وہ اکثر اپنے کمرے  
میں بیٹھے ہی بیٹھے جیرت انگیز طور پر غائب ہو جایا کرتا تھا۔ جعفری کے کمرے کا دروازہ اسی بڑتے  
کمرے میں لختا تھا جس میں رشیدہ اور راحلہ بیٹھا کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ دوسری طرف صرف  
کھڑکیاں تھیں اور ان میں بھی لوٹنے کی سلاسلیں لگی ہوئی تھیں۔ ورنہ یہ خیال ہوتا کہ وہ پاہر  
جانے کے لئے ان کھڑکیوں ہی کو استعمال کرتا ہو گا۔ لہذا رشیدہ کا خیال تھا کہ اس کے کمرے میں  
چور دروازہ ہے اور وہ اسے ڈھونڈنے کاانا چاہتی تھی۔ اسے اطمینان تھا کہ جعفری دس بجے سے  
پہلے آفس میں نہیں آئے گا ورنہ شاید وہ اس کی بہت بھی نہ کرتی۔ کیونکہ محض اس کی آنکھوں ہی  
سے اس کی روح فنا ہونے لگتی تھی۔ آٹھنے کوئے ہے تھے سماں ہے تو بچے قبل برا جیل کے آنے  
کے بھی امکانات نہیں تھے۔

صفائی کرنے والا کمرے کی صفائی کر کے جا پکتا تھا اور چپر اسی بڑتے کمرے کے پاہر اسٹول پر  
بیٹھا بڑے مزے سے سگریٹ پی رہا تھا۔ رشیدہ کو خلاف معمول اتنے سویرے دیکھ کر اسے جیرت  
ہوئی۔ لیکن رشیدہ نے پچھلے دن کے بقیے کام کو پنٹا نے کا پہنچا کر کے اس کی جیرت زیادہ نہ بڑھنے  
دی۔ جالا تکہ یہ چیز تجسس اینڈ جعفری کی فرم کے قاعدے کے خلاف تھی۔ لیکن چپر اسی شایدی  
سوچ کر چپر ہو رہا کہ میں صاحب ابھی بھی تین پھنسی ہیں۔ جس دن فتحر صاحب نے کان کھوی دیئے  
ہے بھیک ہو جائے گا۔

رشیدہ فائیل نکال کر ناپ کرنے بیٹھ گئی لیکن چپر اسی کام سلسلہ؟ وہ سوچ رہی تھی کہ اسے کس  
طرح نالا جائے۔ دفتار اسے اس نے آواز دی۔

”دیکھو....!“ اس نے کہا۔ ”مجھے دور جن لفافوں اور اسنتے ہی پویسٹ کارڈوں کی ضرورت  
ہے اگر لادو تو برا کام کرو۔ ابھی کافی وقت ہے۔“

”لادوں گا! میں صاحب۔“ دہ دانت نکال کر بولا۔ ”یہ بھی کوئی کام میں کام ہے۔“

رشیدہ پانچ کا نوٹ نکال کر اسے دیتی ہوئی بولی۔ ”بیکھرے ناشتے کے لئے۔“

”اڑے..... ہی..... ہی..... ہی.....“ چپر اسی نے ایک بار پھر دانت نکال دیئے۔

رشیدہ نے اطمینان کا سائز لیا۔ ذا کھانہ اتنی دور تھا کہ آدھ گھنٹے بے قبل اس کی واپسی ناممکن

"اچھا تو تم بیہیں بیٹھو۔" حید المحتا ہوا بولا۔ "ابھی آفس میں والیں نہ جانے۔ اس چیز اسی کو دیکھتی رہو اور اس سے جو کچھ بھی منگولیا ہے باہر ہی لے لو تو بہتر ہے پھر تم نہایت آسانی سے اسے سمجھا سکتی ہو کہ تم ابھی آفس والیں نہ جاؤ گی۔ کیونکہ تمہیں ایک دوسرا ضروری کام ہم یاد آگیا ہے۔ سمجھ گئیں۔"

"اچھا پھر ہے۔"

"اپنے وقت سے آفس جاؤ گی۔"

"ٹھیک لیکن اگر چہر اسی نے اس کا تذکرہ کسی سے کر دیا تو۔"

"دیکھا جائے گا۔ تم نے ضرورتا تو ملازمت کی نہیں ہے۔"

حید ریستوران سے چلا گیا اور رشیدہ باہر آبیٹھی۔ اس نے بیرے کو بلا کرنا شے کا آرڈر فریا اور نیچے پاٹھ پر نظریں جوادیں۔ ابے ڈر تھا کہ کہیں چپر اسی نکل نہ جائے۔

چپر اسی خلاف موقع جلد ہی نظر آگیا۔ لیکن ساتھ ہی رشیدہ کو ایک دوسرا خیال بھی آگیا۔ وہ بلدی میں اپنا فاکل میز پر ہی چھوڑ آئی تھی اور اس کی عدم موجودگی میں اس کا وہاں پالیا جانا قطعی ہنا سب تھا لہذا اس نے چپر اسی کو باہر ہی روکنے کا خیال ترک کر دیا۔ ابھی سماڑھے آٹھ ہی بجھ تھے۔

اس نے جلدی جلدی الناسید ہاتھا شے کیا اور باہر نکل آئی۔ آفس پہنچنے تو چپر اسی لہک کر اٹھا۔

"میں ذرا ناشتہ کرنے پلی گی تھی۔" رشیدہ نے اس سے لفافے اور پوٹ کارڈ لیتے ہوئے چپر اسی بنے لقیہ پیے بھی واپس کرنے چاہے لیکن رشیدہ نے لینے سے انکار کر دیا۔

ٹلام کر کے بوڑھنے لگا۔ "خدا آپ کا بھلا کرنے۔ پچے کے لئے چل ہو جائے گی۔ مس صاحب پرے آٹھ پہنچے ہیں۔ بہت غریب آدمی ہوں۔ بیہاں کل پہاڑھ روپے ملتے ہیں نہ انعام نہ بخش۔ خدا آپ کا بھلا کرے۔"

"چچچچ...!" رشیدہ غمناک انداز میں سر ہلا کر بولی۔ "میں کسی دن تمہارے پھوٹ سے ملنے کے لئے آؤں گی۔"

"اے.... آپ مس صاحب.... ہم غریب آدمی ہیں۔"

"غریب سے کیا ہوتا ہے ہمارے بھائی ہو۔"

"خدا آپ کا بھلا کرے۔" چپر اسی پیشانی کی طرف ہاتھ لے جاتا ہوا بولا۔ "مگر... مس

تھی۔ اس نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ جعفری کے کمرے کا دروازہ کھولा۔ بیہاں کچھ زیادہ فرنچ پر نہیں تھا۔ سامنے ایک بڑی سی میز تھی اور اس کے پیچے ایک چکر کھانے والی کرسی اور ایک تجویری، دونوں بازوں میں دو بڑی بڑی الماریاں تھیں جن کی چوڑائی نے دونوں طرف کی دیواروں کو تقریباً ڈھک لیا تھا۔ رشیدہ نے سب سے پہلے دونوں الماریوں کے پیچے جھانک کر دیکھا۔ دیواریں سپاٹ تھیں۔ پھر وہ میز کی طرف بڑھی۔ کرسی کے پیچے لکڑی کا ایک بڑا صندوق نظر آیا جو مغلل نہیں تھا۔ رشیدہ نے یونہی بے خیال میں اس کا ڈھکن اٹھا دیا۔ اور پھر دوسرا صندوق میں اس کی بساں بڑی طرح پھول رہی تھی۔ پورا صندوق روپورا زے سے بھرا ہوا تھا اور یہ شب بالکل نئے تھے۔

رشیدہ نے یہیں ایڈ جعفری کی تجارت کے مقعنی اچھی طرح خانہ میں کی تھی اور اسے یقین تھا کہ اسلوچن جات کی تجارت اس فرم میں نہیں ہوتی تھی۔ اس نئی دریافت سے پیدا ہو جانے والے جوش نے فی الحال چور دروازے کا خیال تو اس کے ذہن سے نکل ہی دیا۔ صندوق کا ڈھکن بند کر کے وہ ائمہ پاؤں اپنے کمرے میں واپس آگئی۔

وہ کچھ ذیر تک اپنی میز پر بیٹھی ہاپنچی اور چھرے سے پیٹھ پوچھتی رہی پھر یکبارگی اٹھی اور باہر نکل آئی۔ اس نے مکھ سراغ رشانی کے ان آدمیوں میں سے کسی کی غلاش تھی جنہیں فریدی نے یہیں ایڈ جعفری کے دفتر کے قرب و جوار میں رہنے کی تائید کی کر دی تھی۔

سامنے والے ریستوران میں اسے ایک جانے پہنچانے چھرے کی جھلک دکھائی دی۔ سر جنت حید تھا اور اب تک اسی تھکاری ہی والے بھیں میں تھا۔ رشیدہ نے شیزی سے سڑک پر کی اور ریستوران میں داخل ہو گئی۔

"ہلو!..!" حید نے سکر اکرانے آنکھ ماری۔

"میں نے ایک نئی دریافت کی ہے۔" رشیدہ ادھر ادھر دیکھ کر بولی۔ "اس کہیں میں اٹھ چلو۔" وہ دونوں کہیں میں آکر بیٹھنے لگے اور رشیدہ نے پردہ کھینچ دیا۔ پھر اس نے جلدی بلدی اپنا کارنامہ دھر لیا۔

"تمہیں یقین ہے کہ اسلوچن کی تجارت ہوتی ہے۔" حید نے پوچھا۔

"سو فیصدی یقین ہے۔"

راحیلہ بیٹھے گئی۔ اس کے چہرے پر الجھن کے آثار نظر آرہے تھے۔

”آخر بات کیا ہے؟“ رشیدہ نے حیرت سے پوچھا۔

”کوئی بات نہیں۔“ سب انپکٹر نے کہا اور سکریٹ سلاگنے لگا۔

ٹھیک دس بجے جعفری افتر میں داخل ہوا۔ پولیس والوں کو دیکھ کر ایک لمحے کے لئے ٹھکانہ

پر انہیں گھورتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

”آہم....!“ غراہب سنائی دی۔ ”کیا بات ہے؟“

”اس کمرے کی تلاشی لئی ہے۔“ سب انپکٹر بولا۔

”کیوں؟“

”اوپر سے حکم ملا ہے اور یہ رہا تلاشی کا وارث۔“

”آہم....!“ جعفری کی غراہب بڑھ گئی۔ ”اسن جماعت کا مقصد۔“

”تم یہاں ضفول باتیں سننے کے لئے نہیں آئے۔“ ایک سب انپکٹر بگز کر بولا بھر اس پہنے

اپنے ساتھی کو اشارہ کیا اور وہ دزانہ جعفری کے کمرے میں گھستے چلے گئے۔ رشیدہ کا دل شدت سے

دھڑک رہا تھا اور وہ بار بار اپنے ہونوں پر زبان پھیر رہی تھی۔

”رشیدان لوگوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ جعفری نے رشیدہ اور راحیلہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

”میں جیسی باریتی کا فاکل لیتے اندر جا رہی تھی۔“ راحیلہ نے شکایت آئیز لجھ میں کہا۔

”لیکن انہوں نے مجھے اندر نہیں جانے دیا۔“

”ان کی شامت آئی ہے۔“ جعفری بلند آواز میں بولا اور رشیدہ متھر رہ گئی۔ کیونکہ اس نے

یہ جملہ دراصل پولیس والوں کو منانے ہی کے لئے کہا تھا۔

جعفری اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ اسکے بعد راحیلہ بھی انھی اور رشیدہ نے اس کی تقدیم کی۔

سب انپکٹر بکس کا ذہن انٹھائیے اپنے ساتھیوں کو گھویر رہا تھا اور بکس بالکل غالی تھا۔ رشیدہ

کے پیروں تسلیتے زمین نکل گئی۔ اچھا ہی ہوا کہ جعفری پولیس والوں کی طرف متوجہ تھا اور نہ

رشیدہ کے پیروں کی بدلتی ہوئی غالتوں سے کم از کم کھلکھل ضرور جاتا۔

”آخر مطلب کیا ہے؟“ جعفری گرج کر بولا۔

”ار... بات یہ ہے۔“ سب انپکٹر گھر ائے ہوئے تجھے میں بولا۔“ میں اطلاع ملی ہے کہ،

صاحب ایک بات کہوں... آپ نئی ہیں۔“

”کیا... کہو کہو۔“

”صاحب براہ راست آدمی ہے۔ کسی کی عزت نہیں سمجھتا اس کا حکم ہے کہ نہ وقت سے

پہلے آؤ اور نہ وقت کے بعد رکو۔ ولایت ہو آیا ہے تا۔ پانچ برس وہاں رہا ہے۔ کہتا ہے سب کام

قادرے سے ہونا چاہئے۔ اگر اسے کبھی معلوم ہو گیا کہ آپ وقت سے پہلے آئی تھیں... تو۔“

”اوہ....!“ رشیدہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ ”تو میں چل جاؤں۔“

”ہاں مس صاحب وہ بہت نہ آدمی ہے۔“

”تو تم کسی سے کہو گے نہیں۔“

”ارے نہیں صاحب۔“

رشیدہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ ایک بہت براہ مسئلہ خود بخود حل ہو گیا تھا اس نے جلدی سے

فاکل کو الماری میں ڈالا اور اپنا ہینڈ بیگ سنبھالتی ہوئی باہر نکل آئی۔

”بقیہ وقت اس نے دوسرا سڑک کے ایک ریستوران میں گزارا اور ٹھیک سوانو بجے وہاں

سے آفس چل پڑی۔ آفس پہنچتے سڑک پر نوچ گئے۔ بڑے کرنے میں دو پولیس انپکٹر چند

کاشیلوں کے ساتھ موجود تھے اور راحیلہ کھڑی انہیں گھویر رہی تھی۔ رشیدہ وہ بھی ابھی آئی

تھی۔ اس نے رشیدہ کی طرف بھی خیز نظروں سے دیکھا اور اپنی میز پر بیٹھ گئی۔ رشیدہ نے بھی

چھرے پر حیرت کے آثار بیدا کئے اور راحیلہ سے سر کے اشارے سے ان کی موجودگی کا مطلب

پوچھا راحیلہ نے نئی میں سر ہلا دیا۔

رشیدہ نے اپنا فاکل نکالا اور تاہپ رائٹر سنجال بیٹھی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے تراہما کر ایک

سب انپکٹر کو مخاطب کیا۔ ”کس کا انتقام ہے آپ کو۔“

”جعفری صاحب کا۔“ اس نے جواب دیا۔

انتہی میں راحیلہ شاید کسی کاغذ کے لئے جعفری کے کمرے میں جانے لگی لیکن سب انپکٹر

نے اسے روک دیا۔

”کیوں؟“ راحیلہ گھر اکر بولی۔

”یونہی! تشریف رکھئے۔“

ایک سب انپکٹر تھے خانے کی طرف بڑھا لیکن پھر رک کر جعفری کی طرف دیکھنے لگا جو کری پر بیٹھ کر اپنا پاپ سلاگنے لگا تھا۔ اس نے اپنی بھنوئیں تان کر سب انپکٹر کی طرف دیکھا اور پاپ کو دانقوں میں دبائے ہی دبائے کہنے لگا۔ ”جاونا... لیکن میں تمہارا ساتھ نہ دے سکوں گا۔ میرے پاس بر باد کرنے کے لئے وقت نہیں۔“

وہ سب انپکٹر تین کا نیٹلوں کے ساتھ نیچے آت گیا۔ دوسرا اوپر ہی رہا۔ ”لڑکیو! بیٹھ جاؤ۔“ جعفری رشیدہ اور راحیلہ کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”ابھی یہ لوگ نہ کا تباشہ دکھائیں گے۔“

”میں کہتا ہوں۔“ سب انپکٹر نے جھلا کر کہا۔ ”آپ اتنے بد تہذیب کیوں ہیں۔“

”آہم... آدمی کو بیچان کر بر تاؤ کرنے کا عادی ہوں۔ میں تمہارے لئے پر ہر جانے اور ازالہ حیثیت عرفی کا دعوی کروں گا... مذاق ہے۔“

توڑی دیر بعد انپکٹر و اپس آگیا اس کے چہرے سے پریشانی ظاہر ہو رہی تھی اپنے ساتھی کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”شراب کی پیٹیاں ہیں.... اور غالباً....!“

”جناب....!“ جعفری نے اس کی بات کاٹ کر مضحكانہ انداز میں کہا۔ ”اور فرم کے پاس دلائی شراب و رآمد کرنے کا لائنس بھی ہے۔“

”پیٹیاں کھلی ہیں یا بند۔“ انپکٹر نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔

”بند ہیں۔“

”تو وہ کھوئی جائیں گی۔“

”کھولو....!“ جعفری لاپرواں سے بولا۔

تقریباً دو گھنٹے تک کام جاری رہا لیکن پیٹیوں میں شراب کی یو تکوں کے علاوہ اور کچھ بھی نہ لکھا۔ تہہ خانے میں کسی دوسرا دروازے کی بھی علاش کی جا رہی تھی لیکن بے سود... پولیس والے ہائپنے ہوئے تہہ خانے سے نکلن آئے۔

”میں پورے آفس کی جلاشی لوں گا۔“ ایک بولا۔

”ضرور بولو....!“ جعفری غرایا۔ ”کم از کم دلاکھ ہر جانے کا دعوی کروں گا۔“ رشیدہ کی حالت اتر تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ فریدی کو کیا جواب دے گی۔ آفس کے

یہاں.... اس کمرے میں کوئی چور دروازہ ہے۔“

جملہ ختم ہونے سے پہلے ہی دوسرے سب انپکٹر نے کمرے کی دیواروں کو کھنکھانا شروع کر دیا تھا۔

”گٹ آؤٹ۔“ جعفری حلق کے بل چین۔ اس کی خوف ناک آنکھیں ابل پڑی تھیں اور پھرہ پہلے سے کہیں زیادہ بہبیت ناک معلوم ہونے لگا تھا۔

”لیکوئچ چلیز...!“

”آلی نے سے گٹ آؤٹ۔“ جعفری ایک قدم آگے بڑھتا ہوا بولا۔

”مجھے مجبور نہ کیجئے کہ میں آپ کو حرast میں لے لوں۔ آپ اس طرح براہ راست حکومتی اہلکاروں کی توہین کر رہے ہیں۔“

دفعٹ جعفری اپنارویہ بدلت کر آہستہ سے بولا۔ ”مجھے افسوس ہے! لیکن آپ کو بھی یہ نہ چاہئے کہ معزز اور بے ضرر شہریوں کی توہین کرتے پھریں۔ فرض کرو کہ اگر یہاں کوئی چور دروازہ ہے بھی تو حکومت کو اس سے کیا واسطہ۔“

”پکھ دیر قبل....!“ سب انپکٹر چاروں طرف دیکھتا ہوا بولا۔ ”یہاں سے کچھ غیر قانونی اشیاء اسی چور دروازے سے باہر لے جائی گئی ہیں۔“

”یقیناً... حکومت نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔“ جعفری نے تیغ لبھ میں کھا اور پھر اس سب انپکٹر سے بولا، جو دیواریں کھنکھانا تا پھر رہا ہے۔ ”کیوں؟ پلاسٹر اور وقت بر باد کر رہے ہو۔ یہ رہا چور دروازہ۔“

اُس نے بڑی میز کو دھکا دیا اور وہ ایک تیز قسم کی آواز کے ساتھ چکنے فرش پر پھسلتی ہوئی دوسری طرف چل گئی۔ پھر اس نے میٹل پیس پر رکھے ہوئے ایک آدھے بجسے کاسر گھمایا۔ کھنکا کی آواز کے ساتھ فرش کا درمیانی حصہ کھلک گیا اور ایک تاریک سی خلاء ظاہر ہو گئی۔

”یہ ہے وہ چور دروازہ۔“ جعفری غرایا۔ پولیس والے کبھی حرمت سے اسے دیکھتے تھے اور کبھی تہہ خانے کے تاریک دہانے کو۔

”جاوہ دیکھو....! کیا ہے اس میں۔“ جعفری پھر غرایا۔ ”شاید وہ غیر قانونی اشیاء اسی کی منتظر رہی ہوں.... جاؤنا.... وہاں بھیڑیے نہیں ہیں۔“

دوسرے کروں کی بھی تلاشی لگی لیکن نتیجہ وہی صفر۔ ریو اور توکیاریو اور کی تصویر بھی نہ مل سکی۔ تلاشی ختم ہونے کے بعد جعفری نے چنگاڑا چنگاڑا کر سارا دفتر سر پر اٹھایا۔ پولیس والوں کے چلے پر بھی وہ کافی دریک بیٹھا کسی غصیلے بلڈاگ کی طرح غراٹا رہا۔

آفس نام کے بعد رشیدہ باہر نکلی تو نبیری طرح گھبرائی ہوئی تھی۔ بن شینڈ پر حمید سے ملاقات ہو گئی۔ شاید وہ وہاں اسی کا انتظار کر رہا تھا۔

”کیوں؟ کیا یہ اسی رات کا بدلہ تھا۔“ حمید نے منہ بنا کر کہا۔

”خدا کی قسم مجھے خود جرت ہے۔“ رشیدہ جلدی سے بولی۔ ”میں یہی سوچ رہی تھی کہ تم بھی سمجھو گے۔“

”بہر حال مجھے کافی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔“ حمید نے کہا۔ ”اس وجہ سے اور پریشانی ہے کہ میں نے فریدی صاحب سے مشورہ لئے بغیر تلاشی کا وارثت نکلوالا یا تھا۔“

”پھر اب بتاؤ میں کیا کروں۔“ رشیدہ بے لمبی سے بولی۔ ”اس لڑکی سے میرا تعارف کر ادوجو تمہارے کمرے میں پیشی ہے۔“ حمید مسکرا کر بولا۔

”مت فضول کو۔“ رشیدہ نے ایک بے جان سے مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”وہ بہت شریف لڑکی ہے۔“

”لڑکی تو ہے.... اگر وہ سینٹی بھی ہوتی تو میں اسے برداشت کر لیتا۔“

”کسی وقت تو سنجیدہ ہو جائیا کرو۔“

”کبھی نہیں۔ آج صبح تمہاری ہی بدولت سنجیدہ ہو گیا تھا۔ نتیجے میں یہ ذات نفیس ہوئی خیر اچھا پھر سکی! نانا۔“

وہ فٹ پا تھوڑے پر ریکنے والی بھیڑ میں غائب ہو گیا۔

## دو مرکار

آر لکچو میں بڑا شاندار پروگرام تھا۔ سردیوں کی خوشگوار رات تھی اور اس لئے اور بھی خوشگوار تھی کہ دوسرے دن اتوار تھا۔

سر جنٹ حمید اور ناگر بیٹھے بڑی دیر سے رقص میں شرکت کرنے والوں کا جائزہ لے رہے تھے۔ یہاں وہ کسی خاص مقصد کے تحت نہیں آئے تھے۔ دن بھر کی دوڑ دھوپ اور جھکن نے انہیں مذہل کر دیا تھا۔ ناگر تو جس وقت سے آیا تھا برابر بیٹھے جا رہا تھا۔ حمید اس وقت شکاری کے لباس میں نہیں تھا۔ البتہ میک اپ وہی پرانا تھا۔ اس نے عمدہ قسم کا ڈزنسوٹ پین رکھا تھا اور کافیوں میں ہیرے ڈال لئے تھے۔ بہر حال وہ اس وقت راجپوتوں کی کسی شاہی نسل کا ایک متول فرد معلوم ہو رہا تھا۔ چڑھی ہوئی گھنی سیاہ موچھیں ظاہری وجہت میں خاص اضافہ تھیں۔

”ابے اوڈا نگر۔“ حمید ناگر کی بولی پر کاگ رکھتا ہوا بولا۔ ”اب بس کرو۔“

”باس! بھی سے باس۔“ ناگر انگلی نچا کر بولا۔

”اے تمہیں بیڑ سے بھی نشہ ہو جاتا ہے۔“

”چو تھی بوتن ہے... ہی ہی ہی میں کیا نشہ۔“

”ابے چلن بھی سکو گے اب تم! مینڈک کہیں کے۔“

”مینڈک ہی ہی ہی.... مینڈک.... مینڈک کا اچار کھایا ہے تم نے کبھی۔“

”مت بور کرو۔“ حمید بھنا کر بولا۔

”آن میں بہت اوس ہوں۔“ ناگر رک رک کر بولا۔

”نہیں دیو داں ہو۔.... مت دماغ چاؤ۔“

”دیو داں بھی پیتے پیتے مر گیا تھا۔... اور میں بھی کسی دن پیتے پیتے مرجاوں گا۔... م...“

اڑ کنور صاحب... میں حمید صاحب کہنے جا رہا تھا۔... کیا نام بتایا تھا آپ نے۔“

”کنور رنجیت سنگھ۔ اگر تم ذرا بھی بہکے تو اتنا ہا تھوڑا رسید کروں گا۔“

”میں تم سے کمزور نہیں ہوں.... ہا۔“ ناگر بھنوئیں چڑھا کر بولاتے۔

”نہیں نہیں تم رستم ہو۔“ حمید نے جلدی سے کہا۔ وہ ذر رہا تھا کہ کہیں ناگر نشے میں ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ دفتار اس کی نظریں جھفری پر جم گئیں جو کاؤنٹر پر بار میں سے باشیں کر رہا تھا۔

”ناگر ڈیڑے۔“ حمید بولا۔ ”کیا تم اسے جانتے ہو۔“

ناگر نے مڑ کر دیکھا۔ اس وقت جعفری جمعی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یک بیک حمید نے محسوس کیا جیسے ناگر کا نشہ ہی ہرجن ہو گیا ہو۔ وہ پلٹ کر خوفزدہ نظر وہیں سے حمید کی طرف دیکھنے لگا۔ ساتھ

ہی وہ اپنے خنک ہو نہیں پر زبان بھی پھیرتا جا رہا تھا۔  
 ”کیوں...!“ حمید اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔  
 ”اس کی آنکھیں...!“ تاگر آہستہ سے بڑا لیا۔  
 ”جنہیں پسند نہیں آئیں۔“ حمید نے ہنس کر کہا۔  
 ”میں جا رہا ہوں۔“ تاگر اٹھنے لگا۔  
 ”بیٹھو...!“ حمید اس کے کانہ سے پرہا تھر کھ کر بولا۔  
 ”آنکھیں... مجھے نہ روکئے۔“  
 ”بیٹھو...!“ حمید نے زبردستی اُسے بٹھادیا۔ تاگر بُری طرح کانپ رہا تھا۔  
 ”بیسراور منگاول۔“ حمید نے پوچھا۔  
 ”خنہیں...!“ تاگر نے آہستہ سے کہا۔ وہ اب بھی مژمر کر جعفری کی طرف دیکھتا جا رہا تھا۔  
 ”آخر بات کیا ہے۔“  
 ”وہ آنکھیں۔“  
 ”ارے تو بولونا بایا شعر ہے یا مسرع۔“  
 ”میرا خیال ہے کہ یہ وہی آنکھیں ہیں جنہوں نے مجھے دریا میں چھلانگ لگانے پر مجبور کیا تھا۔  
 ”اوہ...!“ جنہیں یقین ہے۔  
 ”بالکل ویسی ہیں۔“  
 ”تو خپر بھاگنے کی ضرورت نہیں۔“  
 ”میری جان نہ مجھے۔“  
 ”چپ بے... ذیوٹ۔“  
 تاگر ایک طرف گردن ڈال کر بینچے گیا۔  
 ”وہ تمہیں اس میک اپ میں پیچان نہ سکے گا۔“ حمید نے اسے تسلی دی۔  
 ”کون؟ کیا کہہ رہے ہیں آپ... ارے۔“  
 ”چپ رہو پھرندی۔“  
 ”خیر جان تو جانی ہی ہے کیوں نہ میں ہی...!“ تاگر کا کانپتا ہوا تھا اُس کی جیب کی طرف

جارہا تھا۔  
 ”خبردار... پاگل ہوئے ہو۔“ حمید نے اس کا ہاتھ کپڑا لیا۔  
 ”مجھے یقین ہے کہ یہی مشر کیوں ہے۔“ تاگر کپکپاتی ہوئی آواز میں بوڑا۔  
 ”بکون نہیں... محض آنکھوں کی بناء پر... اور پھر تم یقین کے ساتھ کس طرح کہہ سکتے ہو کہ وہ آنکھیں تمہارے مشر کیوں کی ہیں۔“  
 ”پھر یہ ہے کون...!“ تاگر نے پوچھا۔  
 ”جیس ایڈ جعفری کی فرم کا جزل میجر مشر جعفری۔“  
 ”اوہ تب تو،“ تاگر کی آواز میں پھر کپکپاہٹ تھی۔ ”تب تو... پھر آخر فریدی صاحب نے اس کے پیچے آدمی کیوں لگائے ہیں۔“  
 ”پتہ نہیں! چلو چھوڑو۔ ہمیں اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کرنا ہے۔ جیسا کہا جائے گا کریں گے۔ ہائے کیا کیا لیا لیا نظر آرہی ہیں۔“  
 ”یلا لیاں کیا؟“ تاگر نے پوچھا۔ لیکن وہ اب بھی خوفزدہ نظروں سے جعفری ہی کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔  
 ”لبے تم یلا لیلی نہیں سمجھے۔“  
 ”نہیں۔“  
 ”یلا لیلی خوبصورت لڑکی کو کہتے ہیں لفظ ”لڑکی“ میں ”ر“ مجھے بہت گراں گزرتا ہے اور پھر خوب صورت لڑکی اُسے تو چکیلا ہی سانام دینا چاہئے۔ یلا لیلی بہت مناسب ہے۔“  
 ”زبردستی خواہ مخواہ۔“ تاگر نے منہ بنا لیا۔ وہ دراصل کسی طرح جعفری کے خیال سے پیچا چھڑانا چاہتا تھا۔ جواب ہال میں نہیں تھا۔  
 ”زبردستی کیوں؟ ذرا اس یلا لیلی کی آنکھیں تو دیکھو۔“ دفتاً حمید چونک کر بولا۔  
 حمید ایک لڑکی کو بڑی توجہ اور دل چھپی سے دیکھ رہا تھا۔  
 ”واقعی لا جواب آنکھیں ہیں۔“ تاگر بڑا لیا۔  
 ”لیکن تم کو کسی اور کی آنکھیں بھی یاد آرہی ہوں گی۔“  
 ”کس کی؟“

”یہ کیا بلایہ ہے۔“  
”میری لغت میں انہائی حسین لڑکی کو کہتے ہیں۔“  
”تم نکار ہو۔۔۔ ہر جائی کہیں کے امیں تمہیں کئی دنوں سے دیکھ رہی ہوں۔“  
”پھر بھی تمہارے مالک نے مجھے گولی کا نشانہ نہیں بنایا۔“ حمید کے لمحے میں حیرت تھی۔  
”بھلام تم جیسے الباکو۔“  
”میں الباکو ہوں۔“ حمید نے بُر امان کر کہا۔

”بگرو نہیں میری لغت میں البا انہائی شریر لڑکے کو کہتے ہیں۔“  
”کنول ڈار لگ مجھے حیرت ہے کہ تم ابھی تک زندہ ہو۔۔۔ بے چارے ناگر کا تو بہت براہوش ہوں۔“  
”اس مخترے کا حشر۔“ کنول ہنس کر بولی۔۔۔ ”واقعی بہت براہوں ہے۔ یہ کی چار چار بو تلیں ایک ہی نشت میں صاف کر دیتا ہے۔“

”ارے تم اسے بھی پیچان گئی ہو۔“  
”کیوں نہیں! مجھے عرصہ سے تم لوگوں کی جلاش تھی۔“  
”کیوں....!“  
”مالک کا حکم اور جس دن میں نے اطلاع دے دی تم لوگوں کا دادیے جاؤ گے۔“  
”ابھی تک کیوں نہیں دی۔“

”میری مرضی۔“  
”کل کہاں ملوگی۔“  
”کہیں نہیں۔۔۔ لیکن تمہارے گرو گھٹنال کا پتہ آج تک نہ چلن سکا۔“  
”اور تو یہ کہو! اس طرح پتہ لکانا چاہتی ہو۔“

”یہ تم کہہ رہے ہو جسے میں نے تکلیف سے بچانے کے لئے خواب اور دوادی تھی۔“  
”اس ہمدردی کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔“ حمید ہنس کر بولا۔

” مجرم بھی آدمی ہی ہوتے ہیں اور ہر ایک کے لئے ان کے سینے میں پھر کا کلکڑا نہیں ہوتا۔“  
”خوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر حمید بولا۔“ تو۔۔۔ تم آج تک اپنے مالک کی شخصیت کے تعلق کچھ نہیں معلوم کر سکیں۔“

”خدای قسم یہ کنول کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتی۔“ حمید سید حماہو کر بولا۔  
”کنول....!“ ناگر ہنسنے لگا۔ ”شاید آپ اس کی شکل بھول رہے ہیں۔“  
”اور شاید وہ بھی تمہاری موجودہ شکل بھول جائے۔“  
”تو کیا میک اپ ہے۔“ ناگر نے پوچھا۔  
”قطعاً! یہ آنکھیں اور یہ گردن جھکنے کا مخصوص انداز کنول ہی کا ہو سکتا ہے۔“ حمید اپنی جگہ سے اٹھتا ہوا بولا۔

آرکش اشروع ہو گیا تھا۔ لوگ رقص کے لئے اپنی گھنیں چھوڑ رہے تھے حمید جھپٹ کر اس لڑکی کے قرب پہنچا۔  
”لیکن آپ سے رقص کی درخواست کر سکتا ہوں۔“ اس نے بُرے سلیقے سے جھک کر کہا۔  
”جج... جی ہاں... مجھے خوشی ہو گی۔“  
اس دوران میں آرکش رانے دھن بدی اور والٹ بجتے لگا۔ وہ دونوں رقصاصوں کی بھیڑ میں آگئے۔ لڑکی نے اپنا جسم تان کر خوڑی آگے کی طرف نکالی اور کوہلوں کو پیچھے ملا کر حمید کے کاندوں پر زوال ڈال دیا اور حمید نے اسے گول گول چکر دینے شروع کر دیئے۔  
”آپ کو داڑ کا بڑا سلیقہ ہے۔“ حمید آہستہ سے بولا۔

”شکر یہ۔“  
”آپ کے بال بُرے حسین ہیں۔“  
”اور آپ کی موچیں۔“ لڑکی مسکرائی۔ ”حالانکہ نقی ہونے کی وجہ سے ایسی معلوم ہوتی ہیں جیسے کسی امر و در پر گھاس اگ آئی ہو۔“  
”اوہو....!“ حمید نے ہلاکا سا قہقهہ لگایا۔ ”لیکن آپ کی آنکھوں کے کنول بیمیشہ شاداب رہیں گے۔“

”لڑکی ایک طویل ساری لے کر بولی۔“ تو تم نے پیچان لیا۔۔۔ امر و درخت۔“  
”دور ہی سے پیچان گیا تھا۔“  
”تو پھر گرفتار کر دوں۔“  
”ہے ہے! تمہیں میں گرفتار کراؤ گا۔۔۔ تمہیں یہاں میلی کو...!“

”تم ایک بخت بھرنے دل کے متعلق بہت کچھ جانتی ہو۔“ کنول نے منہ بنا کر کہا۔ ”تم روز دی کسی نہ کسی لڑکی کو یہ وقوف بناتے ہو۔ ہر جائی ہو تو۔... ہری چک۔“

”میں نے آج تک کسی لڑکی کو بے وقوف نہیں بنایا بلکہ بتاہی رہا ہوں اور یہی وجہ ہے کہ میں اب تک کتوارا ہوں۔“ حمید کی آواز گلوگیر ہو گئی اور وہ بو تارہ۔ ”بہتری لڑکوں نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا۔ لیکن بعد میں کیڑے نکال دیئے کسی نے کہا کہ تمہاری ایک ناگ چھوٹی ہے اور ایک بڑی۔... اچھا تمہیں بتاؤ۔... اتنی دیرے سے ناق رہا ہوں تم نے کچھ محسوس کیا؟“

۱ ”نہیں تو!...!“

”اگر ایک ناگ چھوٹی ہوتی تو میں باقاعدہ چند کتاب ہوتا۔ ایک لڑکی نے یہ کہہ کر میرا دل توڑ دیا کہ کھٹائی دیکھ کر میری رال پسکنے لگتی ہے۔ ایک نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ میں بڑھاپے میں بالکل کھوست معلوم ہونے لگوں گا۔“

”اور میں یہ کہتی ہوں کہ تم سے بڑا مکار آج تک میری نظروں سے نہیں گزرا۔... وہ کوڑوں کی مار مجھے اب تک یاد ہے اور اس پر تمہارا رد یہ۔ کوئی اوز ہوتا تو اس کے منہ سے آواز بھی نہ لکھتی۔“

”خوب یاد دلایا۔“ حمید نے کہا۔ ”وہ لڑکی نادرہ کہاں ہے۔“

”پتہ نہیں۔... اب میرے ساتھ نہیں ہے۔“

”کنول ڈار انگ۔... میں مرتے وہ تنک تمہیں یاد رکھوں گا۔... ہائے وہ پہلی ملاقات وہ چاندنی رات اب بھی اکثر ذہن کے تاریک گوشوں میں پھسل آتی ہے۔ کاش یہ کم بخت تمہارا مالک درمیان میں حائل نہ ہوتا۔ میں اسے کسی دن تحریز یو پرفون کر دوں گا۔“

”بہت اچھے۔“ کنول نے قہقہہ لگایا۔ ”اس طرح تم مجھ سے یہ پوچھنا چاہتے ہو کہ اب اس سے رابطہ قائم کرنے کا کیا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔“

”چل دیکھیں سمجھ لو۔... ویسے تم مجھے مکار تو سمجھتی ہی ہو۔“ حمید مخصوصیت سے بولا۔

”فی الحال پیغام رسانی کے لئے آدمی استعمال کئے جا رہے ہیں۔ لیکن مجھے یہ نہیں معلوم کہ ان آدمیوں تک اس کے پیغام کس طرح پہنچتے ہیں۔“

وفتحا حمید کی نظر تاگر کی طرف اٹھ گئی جو میز پر سراوندھائے بیٹھا تھا۔ اس نے رقص میں

”دنیں۔... اب میں اسے پچانی کے تختے ہی پر پہنچانا پسند کروں گی۔“

”یہ تبدیلی کیوں؟“

”محض اسلئے کہ وہ آدمی نہیں جاؤ رہے۔ اسے بہتے ہوئے خون بسے بیمار ہے وہ بیھڑیا ہے۔“

”جعفری کو جانتی ہو۔“

”کون۔... وہی خوفناک آدمی۔... جو ابھی کاٹنٹر پر تھا۔“

”ہاں۔... وہی۔“

”آج کل اس کے پیچھے پولیس لگی ہوئی ہے۔“ کنول بولی۔

”کیا خیال ہے کہیں وہی تو تمہارا مالک نہیں۔“

”پتہ نہیں۔... ویسے میں نے اسی لشت پر رکھ لیا ہے۔“

”لشت پر۔“

”ہاں مجھے بھی تو تمہاری ہی طرح مجرموں کی تلاش رہتی ہے۔“

”کیوں۔...؟“

”جس کے متعلق ذرا بھی شبہ ہوا کہ یہ کسی قسم کا مجرم ہو سکتا ہے میں اس کے پیچھے لگ جائی ہوں اور پھر اس کے متعلق معلومات فراہم کر کے اپنے مالک کو اطلاع دیتی ہوں اور پھر وہ اسے

بلیک میل کر کے اپنے گروہ میں شامل ہونے پر مجبور کر دیتا ہے۔“

”تمہاری بھی ڈیوٹی ہے۔“

”ہاں۔...!“

”فی الحال میری سب سے بڑی آنزو بھی ہے کہ۔...!“

”کیا۔...؟“

”ہم سے مل کر کام کرونا۔“ حمید نے اپنی آنکھیں نشی بنا کر آہستہ سے کہا۔

”یہ کسی طرح ممکن نہیں۔“

”اوہ نہیں۔... چکر پورا نہیں ہوان۔“ حمید نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”بیاں پیر۔... ٹھیک۔... کنول ڈار انگ تم تجھے بڑی پیاری ہو۔“

”تم سور ہو۔ مجھے بے وقوف مت بتاؤ۔“ کنول نے اس کے شانے پر چکلی لی۔

بھی شرکت نہیں کی تھی اور پھر اسے جعفری دکھائی دیا جو ناگر کے قریب ہی کھڑا اسکی عورت سے باٹیں کر رہا تھا۔ عورت کی پشت حمید کی طرف تھی۔ اتنے میں آرکشنر اینڈ ہو گیا تھا۔ رقص اپنی میزوں کی طرف لوٹنے لگے۔ جعفری سے گفتگو کرنے والی عورت مجھے کی طرف مڑی اور حمید نے اسے ایک ہی نظر میں پہچان لیا۔ وہ رشیدہ تھی۔

## شریف بھیریا

رشیدہ اس وقت کی طرح جعفری سے پچھا چھڑانا چاہتی تھی۔ اگر اسے ذرہ برابر شبہ بھی ہوتا کہ جعفری اسے یہاں مل جائے گا تو وہ ادھر کارخانہ نہ کرتی۔ دن بھر کی کوفت دور کرنے یہاں چلی آئی تھی۔ ویسے اسے یہاں جعفری کو دیکھ کر حیرت ضرور ہوئی۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ وہ بہت ہی خنک اور غیر سو شل قسم کا آدمی ہے اور پھر اسے بھول کر بھی یہ موقع نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اس سے ہنس ہنس کر باٹیں کرے گا۔ بہر حال وہ اس گے اس روایہ پر نکلک ضرور گئی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ شاید جعفری کو اس کی تلاشی والی حرکت کا علم ہو گیا تھا اور وہ اس طرح اسے کسی جاں میں پھنسانے کی کوشش کر رہا ہے۔

رشیدہ نے سرجن حمید اور ناگر کو بھی دیکھا تھا۔ دوسرا اداڈ شروع ہوتے ہی حمید پھر اس لاکی کے ساتھ ناپنے لا گئا جس کے ساتھ اس نے نپلے رقص کیا تھا۔ ناگر کو میز پر سر اونڈھائے دیکھ کر اس نے یہ اندازہ لگایا کہ وہ شاید زیادہ پی گیا ہے۔ کیونکہ ثراپ کی بوتل اب بھی اس کی میز پر رکھی ہوئی تھی۔

”آؤ..... لاوئخ میں چلیں۔“ جعفری نے دوسرا اداڈ شروع ہوتے ہی رشیدہ سے کہا۔ لاوئخ بالکل خالی تھی۔ وہاں بیٹھنے والے سب کے سب رقص میں شرکت کرنے پلے گئے تھے۔

جعفری نے بیٹھتے ہوئے جھک کر آہستہ سے کہا۔ ”لاکی تم نے مجھے دھوکہ کیوں دیا۔“ رشیدہ کو اپنی روح جسم سے پرواز کرنی معلوم ہونے لگی۔ وہ اس سے آنکھیں چرارہی تھی۔ ”تم شاید میری آنکھوں کی طرف دیکھنا پسند نہیں کر تیں۔“ جعفری نے خوفناک آواز میں ہنس کر کہا اور جیب سے تاریک شیشوں کی عینک نکال کر اگالی۔ کچھ دیر رشیدہ کی گھبرائیت سے غالباً

لطاف اندوں ہو تارہ بھر نرم لجھ میں بولا۔ ”میں نے تمہارے متعلق سب کچھ پتہ لگالیا ہے۔“

رشیدہ کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔

جعفری نی بوتا رہا۔ ”تم نے کہا تھا کہ تم نیو اسٹار کے زائد اسٹاف میں تھیں۔ لیکن مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم وہاں سے ایک رقم کو خرد برد کر دینے کے لازام میں نکالی گئی ہو۔“

رشیدہ نے اطمینان کا سائز لیا۔ حقیقتاً نور نے یہی چال چلی تھی۔ غالباً اس کے لئے اسے نزدیکی سے یہی مشورہ ملا تھا۔ رشیدہ کی علیحدگی کی وجہ غبن دکھائی گئی تھی۔

رشیدہ نے جلد ہی اپنی حالت پر قابو پالیا اور بڑے مسکین لجھ میں بوی۔ ”بھر میں کیا کرتی۔ کیا بھوکون مرتی۔ اگر میں علیحدگی کی اصل وجہ ظاہر کر دیتی تو مجھے کون ملازم رکھتا۔“

”کتنی رقم تھی؟“

”صرف ساڑھے تین سوروپے جو میں نے ایک سوں ایجنت سے زر خلافت کے طور پر دصول کر کے بعض ضروریات پر صرف کر دیئے تھے۔ میرا رادہ تھا کہ تھوڑا تھوڑا کر کے کسی طرح نہیں کر دوں گی۔ مگر اچانک اس ایجنت کی ملاقات براؤ راست فیجر سے ہو گئی۔“

”خیر..... لکرناہ کرو۔ مجھے توقع ہے کہ تم کم از کم میرے ساتھ اپناہ کرو گی۔ ویسے میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم بڑی دلیر لڑکی ہو اور میں کم از کم ہر دلیر فرد کو دولت مند دیکھنا پسند کرتا ہوں۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔“ رشیدہ نے کہا۔

جعفری نے ایک دیٹر کو اشارے سے بلا کر کافی کے لئے کہا اور پھر رشیدہ کی طرف مڑ کر بولا۔ ”میں تمہیں دولت مند دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”بھی....!“ رشیدہ کا دل پھر دھڑکنے لگا تھا۔ لیکن اس بار وجہ خوف نہیں تھی، بلکہ اپنے مقصد میں کامیابی کا خیال اس کے ذہن میں یہ جان برباکے ہوئے تھا۔

”تمہیں دولت مند دیکھنا چاہتا ہوں۔ اپنے مخصوص اسٹاف میں جگہ دینے کے متعلق غور کر رہا ہوں۔“

”آپ کا بہت بہت شکریہ۔“ رشیدہ کی آواز کپکپا رہی تھی۔

”لیکن لڑکی! ایک بات ذہن میں رکھنی پڑے گی کہ تم مجھے دھوکہ دینے کی کوشش نہیں کرو گی۔“ ”دھوکا! نہیں کبھی نہیں۔ دھوکہ تو میں نے انہیں بھی نہیں دیا۔ میری نیت درست تھی۔“

”میں دیدہ دانستہ اس پر سختی کرتا ہوں۔“

”کیوں؟“

”کافی خوبصورت لڑکی ہے اگر کسی جال میں بچنے گئی تو.... اس کا خاندان تباہ ہو جائے گا۔ اس کی بیوہ اندھی ماں....!“

”آپ جانتے ہیں۔“

”کیوں نہیں۔“ جعفری بولا۔ ”میں اسی لئے اس پر سختی کرتا ہوں کہ وہ سکھار کرنا چھوڑے۔ دفتر کے کئی کلرکوں نے اس پر ذورے ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن میں نے معاملات کو آگئے نہ بڑھنے دیا۔“

”جسچا آپ فرشتہ ہیں۔“

کار شہر کی ایک دیرانہ سڑک پر جا رہی تھی۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں۔“ دفتار شیدہ چونکہ کربولی۔

”بُن اب دور نہیں ہے۔ میں دراصل ایک آدمی کی عدم موجودگی میں تمہیں اُس سے ملاتا چاہتا ہوں۔“

رشیدہ خاموش ہو گئی مگر اس کا دل دھڑکنے لگا۔

”کیا تم ڈر رہی ہو۔“ جعفری نہ کربول۔ ”میری نظروں میں عورتوں کا بہت احترام ہے۔“

اس نے یک یہک ایسی شکل بنائی جیسے کچھ سنخے کی کوشش کر رہا ہو۔ دفتار اس نے رشیدہ سے کہا۔ ”میا کار ڈرائیور کرتا جانتی ہو۔“

”جی ہاں۔“

”اچھا تو چند منٹوں کے لئے اسٹینرگ سنبھال لو۔“

رشیدہ نے اسٹینرگ پر ہاتھ رکھا اور وہ اچھل کر پچھلی سیٹ پر چلا گیا۔

”فکر مت کرو، اسٹینرگ کرتی رہو۔“ اس نے آہتہ سے کہا۔

وہ پچھلا شیشہ گرا کر اندھیرے میں گھونٹنے لگا۔ بہت دور سڑک پر ایک بہت بڑا اور متخرک تاریک و دھبہ ساد کھائی دے رہا تھا یہ دراصل ایک کار تھی۔ جس کے ہیڈ لاٹیس روشن نہیں تھیں۔ غالباً جعفری کی کار کا تعاقب کیا جا رہا تھا۔ جعفری نے سیٹ کے نیچے ہاتھ ڈال کر ایک

میں کسی نہ کسی طرح وہ رقم ضرور پوری کر دیتی۔“

”جعفری تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔“

”تمہیں میرے لئے تھوڑی سی سراغ رسانی کرنی پڑے گی۔“

”سراغ رسانی۔“ رشیدہ چونکہ پڑی۔

”ہاں! دفتر ہی میں۔“ جعفری پر خیال انداز میں سر ہلا کر بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ میرے دفتر میں بھیڑوں کی کھال میں کچھ بھیڑ یے بھی گھس آئے ہیں۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔“

”اس شہر میں میرے کچھ حریف بھی ہیں جو مجھے نقصان پہنچانے پر تلے رہتے ہیں۔ تلاشی والا واقعہ تم بھولی نہ ہو گی۔ میرا خیال ہے کہ یہ سب کچھ دفتر ہی کے کسی فرد کے اشارے پر ہوا تھا۔“

”اوہ.... لیکن....!“

”مجھے یقین ہے کہ یہی بات ہے۔“ جعفری ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”کل سے تمہاری تاخواد پانچ ہو روپے ماہوار لگے گی اور اس سراغ رسانی کے سلسلے کے اخراجات الگ... بولو! کرسکو گی۔“

”ضرور کر سکوں گی۔“ رشیدہ بُر بُرائی۔ ”پانچ سوروپے۔ آپ بہت اچھے ہیں اور آپ اتنی نہ بھی دیجے تو میرا افرض تھا۔ بالکل کے نمک حراموں کو جہنم رسید ہی ہونا چاہئے۔“

”مجھے تم سے یہی توقع تھی۔“ جعفری مسکرا کر بولا۔

”دونوں خاموشی سے کافی پیٹے رہے“ پھر جعفری بولا۔ ”یہ راؤٹھ ختم ہونے سے پہلے ہی ہمیں اٹھ جانا ہے میں تمہیں اس وقت ایک ایسے شخص سے ملانا چاہتا ہوں جس کے پیچے تم کل ہی سے لگ جاؤ گی۔“

”بہتر ہے۔“ رشیدہ نے جلدی جلدی کافی پی اور پھر جعفری مل ادا کر کے اٹھا۔ دونوں دوسرے دروازے سے باہر نکل آئے۔ جعفری کی کار قریب ہی کھڑی تھی۔ اُس نے اگلی سیٹ کی کھڑکی کھوئی اور رشیدہ اس کا شکریہ ادا کر کے اندر بیٹھ گئی۔ جعفری اُس کے برابر بیٹھ کر اسٹینرگ کر کے لگا۔ کار شہر کی سڑکوں سے گزر رہی تھی۔ رشیدہ نے موچ میں آکر راحیلہ کا تذکرہ چھیڑ دیا۔

”میں جانتا ہوں وہ بڑی ایماندار لڑکی ہے۔“ جعفری بولا۔

”آپ سے ڈرتی بہت ہے۔“

”میرے زیادہ تر روپے وہی ہضم کر لیتا ہے اور اب تو مجھے اس سے کچھ کچھ نفرت سی ہو چلی ہے۔ نیواشار کے دفتر والی رقم دراصل اسی پر صرف ہوئی تھی۔ اس سورنے میری ذرا بھی بد دندہ کی۔“

”تو تم اس سے الگ ہونا چاہتی ہو۔“

”میں تو چاہتی ہوں لیکن وہ میرا پیچھانہ چھوڑے گا۔“

”اور اگر میں چھڑاؤں تو۔“

”عمر بھر آپ کا احسان بانوں گی۔“

”اچھا میں کوشش کروں گا۔ ویسے وہ سو فیصد ی پولیس کا پھوٹ ہے۔“

”ایسا تو نہیں.... وہ پولیس والوں سے رقم اینٹھنا خوب جانتا ہے۔ انہیں اس بڑی طرح بلکہ میں کرتا ہے کہ خدا کی پناہ۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ جعفری نے کہا اور کاری کی رفتارست ہو گئی۔ تھوڑی دور پل کر ایک کچھ راستے پر مڑی اور شاید ایک یا ڈیڑھ فرلانگ کی مسافت طے کرنے کے بعد رک گئی۔ جعفری اتر پڑا۔ رشیدہ بھی اتری لیکن سہی سہی سی نظروں سے انہیں میں گھور رہی تھی۔ یہاں چاروں طرف جھائیاں ہی جھائیاں نظر آرہی تھیں اور سامنے ایک چھوٹا سا مکان تھا جس کی کھڑکیوں سے زرد رنگ کی ہلکی روشنی چھپ رہی تھی۔ دونوں مکان میں داخل ہوئے اور جعفری نے دروازہ بند کر کے ایک دھنٹاک قہقہہ لگایا۔

رشیدہ سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔ جعفری کی آنکھیں حدود نجہ بھیاں نظر آنے لگی تھیں۔

”کیوں چوہیا۔“ اس کی غرابیت بلند ہو گئی۔ ”تو ایک بھیڑیے کو راستہ دکھانے کی کوشش کر رہی تھی۔“

رشیدہ چیخ مار کر ایک صوفے پر گر گئی۔

جعفری نے پھر ایک قہقہہ لگایا لیکن یہ قہقہہ معنوی اعتبار سے قہقہہ ہرگز نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی شیر دھاڑ کر رہ گیا ہو۔

رشیدہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے ڈی تھی۔

”فریدی ہی نے بھیجا تھا تھے۔“

”نہیں.... نہیں.... یہ جھوٹ ہے۔“ رشیدہ خوفزدہ آواز میں چیختی۔

را انفل نکالی جس کی نال میں نیچے کی طرف ایک بڑی سی نارنج فٹ تھی۔ ”چلتی رہو۔“ وہ آہتہ سے بولا۔ ”ڈر نامت میں فائز کرنے جا رہا ہوں۔“ ”کیوں....؟“ رشیدہ کانپ کر بولی۔

”چھوڑ کمپنی کا کوئی آدمی ہمارا تعاقب کر رہا ہے۔“

”قتل! نہیں نہیں۔“ رشیدہ بوکھلا گئی۔

”اوہ....!“ جعفری غریا۔ ”میں صرف اس کی کار کا ایک ناٹر چھاڑ نے جا رہا ہوں۔“ اس نے را انفل سیدھی کی۔ ٹریگر پر انگلی رکھتے ہی نارنج روشن ہو گئی اور ساتھ ہی فائز بھی ہوا۔ گوئی تعاقب کرنے والی کار کے اگلے پیٹے پر لگی تھی۔

غیر ارادی طور پر رشیدہ کا ہاتھ گیئر پر جا پڑا۔ اور کار کی رفتار کم ہو گئی۔

”کیا کر رہی ہو۔“ جعفری غریا اور رشیدہ کو رفتار پھر تیز کر دی چڑی۔ جعفری پھر بولا۔

”بہت ڈر پوک ہوت۔“

”مجھے کشت و خون سے دلچسپی نہیں۔“ رشیدہ نے کہا۔

”تو کیا میں خونی ہوں۔“ جعفری گیوکر بولا۔

”بھی نہیں۔“ رشیدہ نے جلدی سے کہا۔

جمعفری پھر انگلی سیٹ پر آبیٹھا اور کار ڈرائیور کرنے لگا۔

”مجھے اطلاع ملی ہے کہ تم پہلے کسی زمانہ میں پولیس سے مل کر کام کیا کرتی تھیں۔ اب بھی

کرتی ہو یا نہیں۔“ جعفری اس کی طرف گھورتے ہوئے بولا۔

”حالات پر محصر ہے۔“ رشیدہ نے بے پرواہی سے کہا لیکن اس کا دل پھر دھڑکنے لگا تھا۔

”اونور تھا راشوہر ہے۔“

”نہیں صرف دوست ہے۔“

”بڑے کام کا۔.... آدمی ہے اگر اسے بھی میرے ہی فرم میں لے آؤ تو کیا حرج ہے۔“

”ہرگز نہیں۔ بلکہ میں آپ سے یہ استدعا کروں گی کہ میری تنخواہ میں اضافے کا علم اسے نہ

ہونے پائے۔“

”کیوں....؟“

ہوئے تھے.... اور.... وہ چپ چاپ کھڑی تھی۔

”تمہارے حمایتی۔“ وہ گرج کو بوا۔ ”لیکن دیکھنا ہے کہ وہ تمہیں یہاں سے کس طرح لے جاسکتے ہیں۔ پولیس... ہوں.... پولیس میرے نزدیک بے جان کھلونا ہے، جس کی اسپرگ ہب چاہوں توڑوں۔ تلاشی میں، کیا ملا تھا انہیں اور تم نے کیا دیکھا تھا... یعنہ...!“

## گرفتاری اور فرار

رشیدہ کو غائب ہوئے دس دن گذر گئے تھے۔ اس دوران میں انور نے جیس اینڈ جعفری کا پورا دفتر ہلاکر رکھ دیا لیکن کوئی نتیجہ نہ برآمد ہوا۔ جعفری نے رشیدہ سے جو کچھ بھی کہا تھا حق کر دکھایا۔ پولیس اس کا باطل بھی بیکاہ کر سکی۔ ایک طرف اس نے خود حملہ پولیس ہی پر ہر جانے اور اداہ حیثیت عرفی کا دعاویٰ دائر کر کھا تھا اور دوسرا طرف رشیدہ کے خلاف ایک روپرٹ بھی درج کرائی تھی۔ ان نے اس پر الزام لگایا تھا کہ وہ اس کی تجویری کاتالا توڑ کر پندرہ ہزار روپے کے نوٹ نکال لے گئی ہے۔ ثبوت میں اس نے رشیدہ کا پینڈ بیگ پیش کر دیا جو اسے ٹوٹی ہوئی تجویری کے پاس ہی پڑا ملا تھا۔ تجویری کے پینڈل پر رشیدہ کے انگلیوں کے نشانات مکمل گئے۔ یہ تجویری کی کنجی اسی کے کمرے میں رکھی رہتی تھی۔ اس واقعے والی شام کو جعفری نے رشیدہ کو تجویری کی کنجی دے کر اس میں سے کچھ نکالنے کو کہا تھا۔ اس طرح تجویری کے پینڈل پر اس کی انگلیوں کے نشانات باقی رہ گئے تھے اور جعفری نے اس وقت تک انکی حفاظت کی تھی جب تک پولیس نے انہیں دیکھ لیا تھا۔

نہ صرف انور بلکہ حمید اور اس کے دوسرے ساتھی بھی اس کے لئے سرگردان تھے۔ البتہ فریدی کا کہیں پہنچنے تھا۔ اب تو حمید کو بھی اس کا علم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے؟ حمید کو یقین کامل تھا کہ رشیدہ کو جعفری ہی نے غائب کیا ہے کیونکہ اس نے ان دونوں کو وقوعے والی رات کو آر لکھو میں ساتھ دیکھا تھا۔ اسے اب رہہ کرافتوں ہو رہا تھا کہ اس نے ان دونوں پر نظر کیوں نہ رکھی۔ اس دوران میں بھی کئی حادثات رونما ہوئے تھے۔ ذی۔ آئی۔ جی کی ہدایت کے مطابق ذاکر نارنگ نے اپنا دیکھی بلکہ غالی کر دیا تھا اور ذی۔ آئی۔ جی نے اس کی گمراہی کرنے کے لئے حملہ سراغِ رسانی کے دو انپکٹر مقرر کر دیئے تھے لیکن دوسری صبح ان دونوں کی لاشیں ملیں۔ ان کے

”مجھے جھوٹا کہتی ہے۔“

”ہاں....؟“

”کیا....؟“

”نہیں تھیں....!“

”تیرے جسم کا ایک ایک ریشدہ الگ کر دوں گا اور کسی کو کافیں کان تک خبر نہ ہو گی۔“

رشیدہ کچھ نہ بولی اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس پر غشی طاری ہو رہی ہو۔

” بتاؤ! فریدی کہاں ہے؟“ جعفری نے اس کی گردنٹ نٹولتے ہوئے کہا اور پھر اس کی گرفت سخت ہو گئی۔

” بتاتی ہوں۔“ رشیدہ گھٹی گھٹی سی آواز میں بولی اور جعفری نے اس کی گردنٹ چھوڑ دی۔

” میں نہیں جانتی۔“ اس نے اپنی گردنٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”پانی... پانی۔“

” تم نہیں جانتیں۔“

” ہاں اس نے مجھے ایک خط کے ذریعے آپ کے یہاں ملازمت کرنے کا مشورہ دیا تھا۔“

” اور تم نے ملازم ہوتے ہی اپنا کام شروع کر دیا۔ کیوں کیا وہ یہ سمجھتا ہے کہ شہر میں جتنے بھی

قل ہوئے ہیں ان میں میرا تھے۔“

” یہ میں نہیں جانتی۔ اس نے صرف یہ لکھا تھا کہ میں ہوشیاری سے سب کچھ دیکھتی اور سنتی رہوں۔“

” تمہارے علاوہ اور بھی کوئی ہے۔“

” میں نہیں جانتی۔“

” خیر... اب اس وقت تک تمہاری رہائی ناممکن ہے جب تک تم یہ سب کچھ اگلے دو۔“

جعفری نے رشیدہ کی گردنٹ پکڑ کر اسے سیدھا کھڑا کر دیا اور اس کے دونوں ہاتھ پشت پر لے جا کر انہیں ایک پتلی سی ڈور سے باندھنے لگا۔ دفتار ان دونوں پر ایک بہت ہی تیز قسم کی روشنی پڑی اور فوراً ہی غائب ہو گئی۔ جعفری غراتا ہوا کھڑکی کی طرف جھپٹا۔ باہر بدستور تاریکی پھیل ہوئی تھی۔ اس نے کھڑکی کے باہر چلا گا لگادی۔ پھر وہ دیوانوں کی طرح قرب وجوار میں گھٹ پھر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہانپتا ہوا کمرے میں واپس آگیا۔ رشیدہ کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے

سر بڑی بے دردی سے کچلے گئے تھے اور لاشیں راستے پر ڈال دی گئی تھیں اسی رات کو ڈاکٹر نارنگر پر ایک بار پھر حملہ ہوا۔ اس کے بیان کے مطابق جب وہ رات کا کھانا کھا کر پائیں بارغ میں ٹھلہ رہا تھا تو کسی نے اس پر چھرے سے حملہ کیا اور اس کا داہنا بازو زخمی ہو گیا۔ زخم زیادہ گہرا نہیں تھا اس نے بتایا کہ وہ حملہ آور کو بیچاں نہیں سکا تھا۔ اگر وہ لڑنے پر آمادہ نہ ہو گیا ہوتا تو حملہ آور دوسرا اوار ضرور کرتا۔ اس کے نوکروں نے اس کی چیز سنی تھی۔

ان حادثات کے بعد ڈاکٹر نارنگر کے دمہی بیٹگلے اور شہری رہائش گاہ پر مسلح پولیس کا پیرہنا دیا گیا۔ لیکن ایک رات بیٹگلے کے پھرے داروں پر کسی نامعلوم آدمی نے دیسی بم پھیکے۔ نتیجہ ہے طور پر ایک ہلاک ہو گیا اور تین کے گھرے زخم آئے۔ البتہ اس کی شہری رہائش گاہ پر پھر کوئی حادثہ نہیں ہوا۔

اب تو ڈی۔ آئی۔ جی کو بھی فریدی پر تاؤ آنے لگا تھا۔ محکمہ سراغ رسانی پر چاروں طرف سے بوچھاڑیں ہو رہی تھیں۔ حکومت نے پورے ملک کے بہترین دماغ ایک جگہ الٹھا کر دیئے تھے لیکن نتیجہ کچھ بھی نہیں ہوا۔ پھر یہ خبر بھی گشت کرنے لگی تھی کہ حکومت عنقریب بر طائفی حکومت سے استدعا کر کے اسکا لینڈیارڈ کے نامور جاسوسوں کی خدمات حاصل کرنے والی ہے۔ ڈی۔ آئی۔ جی اپنے آفس میں بیٹھا بڑی طرح کھول رہا تھا کہ چپر اسی نے ایک کارڈ لا کر پیش کیا۔ ڈی۔ آئی۔ جی پیشانی پر شکنیں ڈالے اس کارڈ کو چند لمحے گھورتا ہا پھر جھنجھلانی ہوئی آواز میں بولا۔ ”آنے دو۔“

نیواسٹار کا کرامہ رپورٹر انور سعید پچھلے کارڈ رداخیل ہوا۔ ”بیٹھ جاؤ۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے مضطربانہ انداز میں کہا جس میں جھنجھلانہ بھی شامل تھی۔ ”وہ لڑکی ملی یا نہیں۔“

”وہ تو نہیں ملی۔“ انور نے کہا۔ ”لیکن اس کا سراغ معہ ثبوت مل گیا ہے۔“ ”یعنی...!“ ڈی۔ آئی۔ جی نے گھورتے ہوئے پوچھا۔

انور نے جیب سے ایک تصویر نکال کر اس کی میز پر رکھ دی۔

”یہ کیا؟“ ڈی۔ آئی۔ جی اس پر جھکتا ہوا بولا پھر سید حافظا ہو کر انور کو گھورنے لگا۔ انور کچھ نہ بولا۔ ”بولنے کیوں نہیں، یہ کون ہے؟“ ڈی۔ آئی۔ جی نے جھنجھلانہ کر پوچھا۔

”جیس ایڈ جعفری کا جزل فیجر جعفری... اور دوسرا رشیدہ ہے۔“

”اوہ....!“ ڈی۔ آئی۔ جی کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”اور غالباً یہی مشرک ہو ہے۔“ انور بولا۔ ”اُسے کسی طرح علم ہو گیا کہ رشیدہ کو فریدی صاحب نے اس کی فرم میں ملازمت کرنے کی ترغیب دی تھی لہذا اس نے اُسے غائب کر دیا اور اس کی چالاکیوں سے تو آپ واقف ہی ہوں گے کہ اس نے کس طرح پولیس پر ازالہ حیثیت عرفی کا دعویٰ کیا ہے اور کس خوش اسلوبی سے رشیدہ کو چور ثابت کر کے اس کے خلاف روپرٹ بھی درج کر دیا ہے۔“

ڈی۔ آئی۔ جی اس تصویر کو رابر گھورے جا رہا تھا۔ یہ جعفری اور رشیدہ کی تصویر تھی جس میں وہ رشیدہ کے دونوں ہاتھ اس کی پشت پر باندھ رہا تھا۔

”تمہیں یہ ملی کہاں سے۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے پوچھا۔

”ایک خط کے ساتھ فریدی صاحب کی طرف سے موصول ہوئی ہے۔“

”فریدی۔“ ڈی۔ آئی۔ جی چونکہ کر بولا۔ ”وہ ہے کہاں... خط لاو۔“

”پتہ نہیں... وہ کہاں ہیں۔“ انور جیب سے خط نکالتا ہوا بولا۔ ”دستی خط... آر لکھو کے دفتر سے ملا تھا۔“

کاغذ پر صرف دو سطریں تحریر تھیں۔

”تصویر بیچ چ رہا ہوں اور مجھے امید ہے کہ تم مجھے نتیجے پر پہنچو گے اُسے ڈی۔ آئی۔ جی صاحب کے پاس لے جاؤ...“ ”F“

”ماں گاؤ...!“ ڈی۔ آئی۔ جی حیرت سے بولا۔ ”تو یہی شخص مشرک ہے۔“

”میرا تو یہی خیال ہے۔“ انور نے کہا۔

”اچھا تو تم جاؤ۔“ ڈی۔ آئی۔ جی اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ”آخبار میں اس کے متعلق کچھ نہیں آنا چاہئے۔“

”بہتر ہے۔“ انور نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

دوسرالحہ ڈی۔ آئی۔ جی کے لئے انتہائی بیجان آفریں تھا۔ وہ خط اور تصویر لئے ہوئے

آئی۔ جی کے دفتر کی طرف پکا۔

پھر آوھے گھنٹے کے اندر ہی اندر جیس ایڈ جعفری کے دفتر کا محاصرہ کر لیا گیا۔ کسی کو سانس

”کیا؟ میں نہیں سمجھا؟“ ڈاکٹر نارنگ نے حیرت سے کہا۔  
 ”آپ نے فون کیا تھا مجھے۔“ ڈی۔ آئی۔ جی چھپھلا کر بولا۔  
 ”میں نے ... نہیں تو۔“  
 ”کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“ ڈی۔ آئی۔ جی بے بی سے بولا۔ ”وہ مشر کیوں بھی ہاتھ آتے  
 آتے رہ گیا۔“  
 ”کیا کیسے ... یہاں کیوں کھڑے ہیں۔ اندر چلے۔“ ڈاکٹر نارنگ بولا۔  
 ”وہ لوگ ملا قاتی کمرے میں آکر بینٹے گئے۔“  
 ”میا مشر کیوں خصیت ظاہر ہو گئی۔“ ڈاکٹر نارنگ نے پوچھا۔  
 ”جی ہاں! لیکن اسے فی الحال اپنے ہی تک مدد و رکھئے گا۔ سر دست تو وہ نکل بھی گیا ہے۔  
 لیکن زیادہ دریکٹ نہیں بخی کے گا۔ سارے ملک میں واٹر لس کے ذریعہ اس کا حلیہ جاری کر دیا گیا ہے۔  
 ”کون ہے وہ؟“  
 ”جیس ایڈ جعفری کا جزل نیجر جعفری۔“ ڈی۔ آئی۔ بولا۔  
 قبل اس کے کہ ڈاکٹر نارنگ کچھ کہتا کمرے کے ایک گوشے میں غراہت سی ستائی دی۔  
 ”جعفری حاضر ہے۔“  
 ”وہ سب چوک کر مڑے۔“  
 جعفری ایک دروازے میں کھڑا نہیں خونخوار نظر وہن سے گھور رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں  
 روپ اور تھا۔ جس کارخانیں کی طرف تھا۔ وہ چاروں اچھل کر کھڑے ہو گئے۔  
 ”کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔“ جعفری غایا۔ ”مشر کیوں پر ہاتھ ڈالنا آسان کام  
 نہیں۔“ ڈی۔ آئی۔ جی صاحب۔“  
 ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے سکھوں کو سانپ سو نگھ گیا ہو۔ البتہ ڈاکٹر نارنگ کے ہونٹوں پر عجیب  
 طرح کی مسکراہٹ تھی۔ جعفری نے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ہھکھڑیوں کا جوڑا نکالا اور  
 اسے ایک انپکٹر کی طرف اچھالتا ہوا بولا۔ ”اپنے ڈی۔ آئی۔ جی اور ڈاکٹر نارنگ کے ہاتھوں میں  
 لگاؤ... چلو... جلدی کرو۔“

انپکٹر نے طوعاً کرہا ایک ہھکھڑی ڈی۔ آئی۔ جی کے اور دوسرا ڈاکٹر نارنگ کے ہاتھ میں

لینے کی مہلت بھی نہ ملی لیکن خود جعفری کا کہیں پتہ نہ تھا۔ پولیس نے عمارت کا گوشہ گوشہ چھلان  
 مارا۔ جعفری کے کمرے والا تہہ خانہ بھی دیکھا گیا لیکن لا حاصل۔ ... دفتر کا سارا عمل حراست میں  
 لے لیا گیا۔ ڈی۔ آئی۔ جی کا دل چاہ رہا تھا کہ اپنے منہ پر تھپٹر مارے۔ جلدی میں اس نے ایک  
 زبردست غلطی کی تھی۔ محاصیرے سے پہلے اسے معلوم کر لینا چاہئے تھا کہ جعفری دفتر میں موجود  
 بھی ہے یا نہیں۔ آئی۔ جی بھی اس کے سر ازام تھوپ رہا تھا۔ حالانکہ وہ خود بھی عقل رکھتا تھا  
 اس کش کش کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند لمحوں کے بعد وہ دونوں ہی متقدہ طور پر فریدی کو ہمراہ بھلاکہ  
 رہے تھے۔

”کیا حماقت کی ہے اس لوٹے نے خود کو نہ جانے کیا سمجھ رکھا ہے۔“ آئی۔ جی بولا۔  
 ”میں خود بھی یہی سوچ رہا تھا۔ آخر اس کرامہ روپر ٹرکو تصور یہ بھیجئے کیا ضرورت تھی۔“  
 ڈی۔ آئی۔ جی نے کہا۔ ”خود آرائی کا نتیجہ ہمیشہ خراب ہوتا ہے۔“  
 ”بہت ہو چکا۔“ آئی۔ جی پھٹکا رہا۔ ”پانی سر سے اوچا ہو چکا ہے۔ میں آج ہی اسے معطل کرنا  
 ہوں اور ساتھ ہی اس کی گرفتاری کا وارث بھی جاری کراؤں گا۔ بہت سرچ ہلاکیا ہے۔ میں کسی  
 ایسے آدمی کا وجود اپنے بھکے میں برداشت نہیں کر سکتا جو ڈسپلن برقرار رکھ سکے۔“  
 ڈی۔ آئی۔ جی کچھ کہنے ہی جارہا تھا کہ میں فون کی گھنٹی بھی۔ ڈی۔ آئی۔ جی نے رسیور اٹھا  
 لیا۔ چند لمحے بُر اسامنہ بنائے ہوئے سفارہ پاھر ایک طویل ”اچھا“ کے ساتھ رسیور ٹھی دیا۔  
 آئی۔ جی سوالیہ انداز سے اسے دیکھ رہا تھا۔  
 ”یہ تو جان ہی کو آگیا ہے۔“ ڈی۔ آئی۔ جی بڑی بڑیا۔  
 ”کون...؟“ آئی۔ جی نے پوچھا۔

”ڈاکٹر نارنگ.... اب نہ جانے کون سی آفت ٹوٹی ہے کہ بلا رہا ہے۔“  
 ”ابھی کیا ہے؟ یہ سارے لیڈر ناظمہ بند کر دیں گے۔ فریدی کے لوٹاپن کی وجہ سے بنا بھا  
 کھیل بگڑ گیا۔“  
 ڈی۔ آئی۔ جی دو انپکٹروں کے ساتھ ڈاکٹر نارنگ کی کوٹھی کی طرف روانہ ہو گیا۔ ڈاکٹر  
 نارنگ برآمدے میں کھڑا پائیں باغ میں پھیلے ہوئے کپوڑوں کے لئے دان ڈال رہا تھا۔  
 ”فرمایے۔“ میں آج بہت مشغول ہوں۔ ڈی۔ آئی۔ جی اس کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔“

ذال دی۔ دوسرے سب انپکٹر کا ہاتھ جیب کی طرف جائی رہا تھا کہ جعفری نے اسے لکارا  
”خبردار میں سر سے پیر تک آنکھیں ہی آنکھیں رکھتا ہوں۔“  
”یہ کیا الغیرت ہے۔“ ذی۔ آئی۔ جی جلا کر چینا۔

”سر کار ناراض نہ ہوں۔“ جعفری قدرے جھک کر بولا۔ اس کا ایک ہاتھ اس کے سر پر تھا  
اس نے اپنے بال مٹی میں جکڑے اور ایک جھرنا سامار۔ بالوں کے ساتھ چہرے کی کھال بھی  
اتری چل گئی اور جب وہ سیدھا ہوا تو ذی۔ آئی۔ جی اور دونوں انپکٹر بے ساختہ چیخ پڑے۔ ”فریدی۔“  
دفتارِ ذاکٹر نارنگ ذی۔ آئی۔ جی پر ٹوٹ پڑا۔ دونوں کے دامنے اور باہمیں ہاتھ ایک ساتھ  
جکڑے ہوئے تھے اور دوسرے دامنیں باہمیں آزاد تھے۔ دونوں ایک ساتھ زمین پر آرہے۔ قبل  
اس کے کہ وہ لوگ سنھلتے ذاکٹر نارنگ اٹھ کر بھاگا۔ پتہ نہیں اس نے کس طرح اپنا ہاتھ ہجھڑی  
سے نکال لیا تھا۔ ہجھڑی بدستور بند تھی۔ فریدی ذاکٹر نارنگ کے پیچھے دوڑا۔ اس کے پیچھے وہ  
نہیں بھی بھاگے۔ وہ سارے کروں میں ناچھتے پھر رہے تھے اور ذاکٹر نارنگ کا کہیں پتہ نہ تھا۔  
”میں بھی شاید پاگل ہو گیا ہوں۔“ فریدی نے کہا اور ایک ست دوڑنے لگا۔ ایک کمرے میں  
پنچ کروہ ایک لحظہ کے لئے رکا۔ یہاں ایک میراثی پڑی تھی غالباً وہ دیوار سے لگی رہی ہوگی۔  
”یہ ہجھڑی لو۔“ ذی۔ آئی۔ جی نے اپنے ہاتھ میں جھولتی ہوئی ہجھڑی کی طرف دیکھ کر  
کھلا۔ ایک انپکٹر نے آگے بڑھ کر ہجھڑی نکال دی۔

فریدی دیوار سے لگے ہوئے ایک ایک ریک پر زور آزمائی کر رہا تھا۔ دفتاریک اپنی جگہ سے  
کھک کر ایک طرف ہو گیا۔ سامنے دروازہ تھا وہ چاروں دیوانہ وار اندر گئے۔  
”برانفلٹ طریقہ تھا۔“ ذی۔ آئی۔ جی بر براہ رہا تھا۔

”جناب والا۔“ فریدی نے مڑے بغیر کہا۔ ”آپ محاصرہ کر کے تو اسے پکڑی نہیں سکتے  
تھے۔ اس عمارت کے پیچے سرگاؤں اور تہہ خانوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ گھبرا یے نہیں! میں جانتا  
ہوں کہ وہ کہاں گیا ہو گا۔“

وہ ایک کشادہ سرگاں میں دوڑ رہے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کچھ نہ پکچھ بولنا چاہتا تھا لیکن ان  
کے دم گھٹ رہے تھے۔ سرگاں تاریک اور معفن تھا۔

”لیکن سن تو سکی۔“ ذی۔ آئی۔ جی ہانپتا ہوا بولا۔ ”ہم کہاں جا رہے ہیں۔“

”بائیم روڈ پر نکلیں گے۔ موڑوں کے کارخانے کے پاس۔ گھبرا یے نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ  
وہ ہیں گیا ہو گا۔ موڑوں کا کارخانہ اسی کا ہے۔ اس نے وہاں سے ایک موڑی ہو گی اور سیدھا سارگ  
میشن گیا ہو گا۔“ فریدی نے کہا۔

”مجھے تواب بھی یقین نہیں آ رہا ہے کہ وہ مسٹر کیو ہے۔“ ذی۔ آئی۔ جی نے کہا۔

”اس سرگاں میں دوڑتے وقت بھی نہیں۔“ فریدی کے لجھ میں تخترا ہا۔ آئی۔ جی کچھ نہ بولا۔

”آخر اتنا اور ہم مچانے کی کیا ضرورت تھی۔“ ایک انپکٹر بولا۔

”اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔“ فریدی بولا۔ ”ذرار فقار اور تیز سیکھ۔“

تھوڑی دیر بعد انہیں روشنی دکھائی دی۔ پھر تین زیوں پر نظر پڑی دوسرے لمحے میں وہ باہر  
تھے ایک بڑا سا پھر ایک طرف پڑا تھا جو غالباً ذاکٹر نارنگ کے نکلنے سے پہلے سرگ کے دہانے پر  
دکھا رہا ہو گا۔ چاروں طرف کردنے کی کائنے دار اور بے ترتیب جھاڑیاں بکھری ہوئی تھیں۔  
انہوں نے بروقت تمام راستہ بنایا اور باہر نکل۔ سڑک زیادہ دور نہیں تھی۔ وہ دوڑتے ہوئے جز ل  
موڑ گیرا ج مک آئے۔ کم از کم ذی۔ آئی۔ جی کے لئے تو یہ نئی اطلاع تھی کہ وہ گیرا ج ذاکٹر نارنگ  
ی کی ملکیت تھا۔ گیرا ج کا منتظم باہر ہی مل گیا۔

”ذاکٹر صاحب آئے تھے۔“ فریدی نے اس سے پوچھا۔  
”جی ہاں۔“ اس نے کہا۔

”تمہاری تھے۔“ فریدی گھبرا کے ہوئے لجھ میں بولا۔ گیرا ج کا منتظم دونوں انپکٹر ووں کو  
بڑت سے دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ انہوں نے ریو اور کارتوسون کی پیشیاں لگا رکھی تھیں۔ منتظم نے  
دواب میں سر ہلا دیا۔

”اُف فو۔“ فریدی نے بے چینی سے کہا۔ ”انہیں منع کیا گیا تھا کہ تمہارا پاہر نہ نکلیں۔ کتنا  
نظر ہے ان کے لئے.... کہاڑ گئے۔“

”ایک کار لے کر کہاڑ گئے ہیں۔“ منتظم نے ایک طرف اشارہ کیا۔

”کوئی اور گاڑی فال تو ہے۔“

”جی ہاں ہے۔“

”فون بھی ہے یہاں.... اچھا ذرا اگاڑی جلدی سے نکلا پئے۔ ان کی جان کو خطرہ ہے۔“

فریدی مضر بانہ انداز میں ہاتھ ملنے لگا۔

”فون ہے آئیے۔“ منتظم گھر اگیا تھا۔ فریدی نے فون پر ہاتھ ڈالا۔

”ہللو... کو تو ای... ڈی۔ آئی۔ جی آف ائیم جس سپینگ... ساگر میشن کا محاصروہ فوراً کر لیا جائے۔ زیادہ سے زیادہ آدمیوں سمیت... فوراً... جلدی۔“

رنیشور رکھ کر فریدی باہر جھاگا۔ کار باہر کھڑی تھی۔ اس نے جھپٹ کر اسٹیرنگ سنجلا اور اس کے ساتھی بھی بیٹھ گئے۔ کار تیزی سے بیلی روڈ کی طرف مڑی اور دونوں انپکٹر دوں کے رکھ دوسرے سے ٹکرائے۔

## لاشوں کی بارش

”آف فون! اکتنا بے وقوف بنے میں ہم لوگ...“ اس کی گرفتاری کے بعد بھی شاید کسی کو مشکل ہی سے یقین آئے کہ وہ خود ہی مشرک ہے۔ ”ڈی۔ آئی۔ جی نے کہا۔

”میرے پاس شوتون کا انبار عظیم ہے۔“ فریدی نے لاپرواں سے کہا۔

”حمد کہاں ہے۔“

”پتہ نہیں! ہو گا کہیں۔“ فریدی بولا۔

”اس بار میں نے انہیں بھی دھوکے میں رکھا ہے۔“ جنہیں خود ہی کام پر لگایا تھا۔ ایک لمحے کے لئے خاموشی رہی پھر فریدی نے کہا۔

”حمد تک کو اس کا علم نہیں کہ مشرک ہوں ہے۔ وہاب بھی جعفری کی تلاش میں ہو گا۔“

”لیکن... کیوں؟“

”اطمینان سے عرض کروں گا۔ فی الحال تو میں بھی امید و نیم کی حالت میں ہوں۔“

”اگر نکل گیا تو بہت برا ہو گا۔“

”ساگر میشن کے علاوہ اور کہیں نہیں جا سکتا۔“ فریدی نے کہا۔

”یقین کی کوئی وجہ۔“

”ہیڈ کوارٹر ہی ہے پانچ دنوں سے متواتر میں اسی چکر میں رہا ہوں اور یقین واٹن ہو جائے۔“

”آن اقدام کا فیصلہ کیا تھا۔ آف فون! آج تو یہ فاصلہ کسی طرح کم ہی نہیں ہو رہا ہے۔“

”دیکھو فقار کم کرو۔ ہم شہر کے آباد حصے میں داخل ہو رہے ہیں۔“

”غالباً پولیس اب تک وہاں پہنچ گئی ہو گی۔“ فریدی نے فقار کم کرتے ہوئے کہا۔

”لیکن تم نے فون پر ایف فون... بڑی غلطی کی۔“ ڈی۔ آئی۔ جی بے چینی سے بیٹھاں رکھنے لگا۔

”جی... کیسی غلطی۔“

”تم نے انہیں یہ نہیں بتایا کہ نارنگ ہی مشرک ہو گی۔ اگر وہ انہیں دھوکہ دے کر نکل گیا تو۔“

”مجھے یقین ہے کہ اگر وہاں پولیس پہنچ بھی گئی ہو گی تو ابھی شاید ہی عمارت میں داخل ہو سکی ہو۔“

”کیوں؟“

”وہاں مشرک ہی کے ساتھ ستر آدمی رہتے ہیں اور ڈاکٹر نارنگ کا ذہنی توازن فی الحال بگرگیا ہے ورنہ وہ اس طرح نہ جھاگتا۔ ظاہر ہے کہ وہ اتنا محاط آدمی تھا۔ خود اس کے آدمیوں کو اس کا علم نہیں کہ مشرک ہی کون ہے۔ اس نے ہر طرح اپنی مضبوطی کر رکھی تھی۔ اگر وہ اس طرح نہ جھاگتا تو اسے مجرم ثابت کرنے میں مجھے دانتوں پسند آ جاتا اور میں نے یہ ڈرامائی انداز مخفی اس لئے اختیار کیا تھا کہ اسے اچاک ڈھنی طور پر انتشار میں بٹلا کر دوں اور وہ گرفتاری کے وقت رد عمل کے طور پر کوئی اضطراری حرکت کر بیٹھے مگر مجھے اس کا گمان بھی نہیں تھا کہ وہ بند ہنگھٹری سے ہاتھ نکال لے گا۔“

”واقعی تم اس سے بھی زیادہ بھیاںک ہو۔“ ڈی۔ آئی۔ جی فریدی کا شانہ تھپکتا ہوا بولا۔ ”اگر خدا نخواستہ کہیں تم بھی غیر قانونی راستوں پر نکل گئے ہوئے تو ہم لوگوں کے لئے ایک مستقل درد سر ہو جاتے۔“

فریدی ہنسنے لگا۔ دفعتاں اس نے کار کی رفتار بالکل کم کر دی اور ڈی۔ آئی۔ جی کی طرف دیکھ کر

آہستہ سے بولا۔ ”سن رہے ہیں آپ۔“

”ارے! یہ تو مشین گنوں کی آوازیں ہیں۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے اچھل کر کہا۔

”وہ دیکھئے۔“ فریدی نے سامنے اشارہ کیا۔ سڑک سنسان پڑی تھی اور ساگر میشن سے چاروں طرف گولیاں بر سر رہی تھیں۔ پولیس کا کہیں پہنچنے تھا۔

فریدی نے بڑی پھرتی سے کار بیک کی۔ اگر وہ دوڑھائی سو گز اور آگے بڑھ گئے ہوئے تو کار گولیوں کی زد پر آ جاتی۔ فریدی نے کار کو اگلی گلی میں موڑ دیا۔ ساگر میشن مقابل سمت کی لائن میں

تھی۔ گلی کے اندر سبھے ہوئے آدمیوں کا ہجوم تھا اور پولیس والے بھی سراسیگی کا شکار ایک دوسرے کی شکلیں دیکھ رہے تھے۔ فریدی کا روک کر کوڈ پڑا۔ وہ سب بھی اترے، اور بھیڑ میں گھستے چلے گئے۔

آگے چل کر ایس۔ پی سے مذبھیڑ ہو گئی۔ وہ ذہنی۔ آئی۔ جی کی طرف چھپنا۔

”ہمارے آئنے سے قبل ہی گولیوں کی بارش ہو رہی تھی۔“ وہ گھبرائے ہوئے لجھے میں بولا۔ ”میرے خدا نہ جانے کتنی لاشیں ساگر میشن کے سامنے پڑی ہیں.... اور.... آئیے میرے ساتھ۔“ ایس۔ پی انہیں لے کر ایک عمارت میں داخل ہو گیا۔ اوپری منزل پر پہنچ کر اُس نے ایک کمرے کے روشنдан کی طرف اشارہ کیا۔

وہ سب روشندانوں سے جھانکنے لگے۔ یہ عمارت ٹھیک ساگر میشن کے سامنے تھی اور یہ لوگ اس کے عقبی راستے سے داخل ہوئے تھے۔

روشندانوں سے آنکھیں لگاتے ہی فریدی اور اس کے ساتھیوں کے منہ سے بیک وقت ”اڑے“ نکل گیا۔ گولیاں ساگر میشن کے ان نتوں سے نکل رہی تھیں جو غالباً بارش کاپانی نکلنے کے لئے لگائے گئے تھے۔ ایک ایک فٹ باہر نکلے ہوئے تل جن کا جھکاؤ غالباً پچھر ڈگری کے زاویے سے سڑک کی طرف تھا۔

”ایسے ہی تل۔“ ایس۔ پی بولا۔ ”پوری عمارت میں چاروں طرف لگے ہوئے ہیں۔ غالباً چوتھی ست بھی گولیاں بر سر رہی ہوں گی۔“

ساگر میشن کے ٹھیک نیچے فٹ پاتھ پر لاشوں کے ڈھیر تھے۔ ”مگر وہ لاشیں۔“ فریدی آہستہ سے بولا۔ ”وہ تو گولیوں کی زد میں نہیں۔ وہاں ان کا ڈھیر کی معنی رکھتا ہے۔“

”اور.... اُف۔“ عمارت کا ایک مکین آگے بڑھ کر ہائپٹا ہوا بولا۔ ”مجھ سے پوچھئے... میرے خدا.... میرے خواں درست نہیں۔ وہ لاشیں ساگر میشن ہی سے گری ہیں۔ لاشوں کا آبشار.... خدا کی قسم.... لاشوں کا آبشار۔ وہ اس طرح گر رہی تھیں جیسے بارش ہو رہی ہو۔ سب سے پہلے لاشیں گریں اور پھر.... ان نتوں سے گولیاں نکلنے لگیں۔ میرا بھائی.... ہائے کہیں!“ بھی.... نہ مارا گیا ہو.... میرے خدا.... اس کا کچھ پتہ نہیں۔“

وہ خاموش ہو کر ائٹھے پاؤں دوڑتا ہوا نیچے چلا گیا۔ گولیاں برابر سے جارہی تھیں۔ فریدی نے ایک بار پھر فٹ پاتھوں پر پڑی ہوئی لاشوں کی طرف دیکھا اور نیچے اتر آیا۔ ”تو اس نے اپنے ساتھیوں کو بھی ٹھکانے لگادیا۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”اب کیا کیا جائے۔“ ذہنی۔ آئی۔ جی پاگلوں کی طرح آنکھیں نکال کر بولا۔ ”فون.... یہاں اس عمارت میں کوئی فون ہے۔“ فریدی ایس۔ پی کی طرف ٹوڑ۔ ”وہ تو ہو گا ہی! یہ بتائیے کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔“ ذہنی۔ ایس۔ پی نے کہا۔ ”مسٹر کیو۔“ فریدی مضطرباً نہ انداز میں بولا۔ ”وہ اس عمارت میں موجود ہے۔“ ایسا معلوم ہوا جیسے ایس۔ پی پر بم گر پڑا ہو۔ وہ حیرت سے منہ اور آنکھیں چھاڑے کھڑا رہا۔ ”کیوں بھی! فون ہے یہاں۔“ فریدی ایک آدمی کی طرف ٹوڑا جو غالباً اسی عمارت کا کوئی فرد تھا۔ ”جی ہاں! آئیے میرے ساتھ۔“

وہ دونوں تیزی سے اترے۔ دوسرے لمحے میں فریدی کی انگلی میلی فون کے ڈائیل پر چل رہی تھی۔ اس نے رسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔ ”تھیلو.... تھیلو۔“ جواب میں ایک خوفزدہ سی نسوانی آواز سنائی دی۔

”ڈاکٹر نارنگ سے کہو۔“ فریدی گرجا۔ ”کب تک گولیاں چلیں گی۔“ ساگر میشن کا ایک تنفس زندہ نہ بچ گا۔ مجھے معلوم ہے کہ ساگر میشن ایک سید ہی سادی کی عمارت ہے۔“ ”وہ پاگل ہو گیا ہے۔“ گھٹی گھٹی سی آواز آئی۔ ”مجھے بچاؤ.... میں ایک کمرے میں پھنسی پڑی ہوں۔ دروازے پر ایک بڑی وزنی الماری اگری ہے۔ میں اسے ہٹا نہیں پا رہی ہوں۔ مجھے بچائیے۔“ ”تم کون ہو؟“ فریدی نے حیرت سے پوچھا۔

”ایک بے بس لڑکی۔ اسے نہیں معلوم کہ میں زندہ نجگنی ہوں۔ ورنہ وہ مجھے بھی نہ چھوڑے گا.... بچاؤ۔“ ”کیا وہ تمہاں ہے۔“

”ہاں.... اس نے سکھوں کو مار ڈالا ہے اور اب ایک مرکزی مشین پر بیٹھا ساری مشین گنوں کو کنٹرول کر رہا ہے۔ خدار کسی طرح آؤ۔ وہ پاگل ہو گیا ہے میں نہیں جانتی کہ اس کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے۔“

”میں آپ کا حکم نہ مانتے پر مجبور ہوں۔“ فریدی نے پلٹ کر اُسے اسی نظر دوں سے دیکھا کہ ڈی۔ آئی۔ جی کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ کسی پاگل کی ویران آنکھیں رہی ہوں۔ بے حس اور خوفناک۔ فریدی ہاتھ چھڑا کر آگے بڑھا۔ لیکن ایس۔ پی دروازے میں حائل ہو گیا تھا۔

”براہ کرم ہٹ جائیے۔ وہاں تک پہنچنا کچھ مشکل کام نہیں۔ تھوڑی سی ہمت کی ضرورت ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ کس کمرے میں ہے۔ عمارت میری دیکھی ہوئی ہے۔ وہ بس انہیں اور پاگلوں کی طرح گولیاں بر سار ہے۔“

”لیکن جاؤ گے کس طرح۔“ ڈی۔ آئی۔ جی بے چینی سے بولا۔

”وہ سارے ٹل دودوٹ کے فاصلے پر لگے ہوتے ہیں۔ اگر میں کسی دو ٹکوں کے درمیان فاصلے کوڑا ہن میں رکھ کر چلوں تو گولیوں سے نج سکتا ہوں۔“

”خطرناک اختیاری خط نراک.... ہرگز نہیں۔“ ڈی۔ آئی۔ جی چیخ کر بولا۔

لیکن اتنی دیر میں فریدی ایس۔ پی کو دکا دے کر پایہر نکل چکا تھا۔  
”پکڑو۔ اے پکڑو۔ پاگل... سور۔“ ڈی۔ آئی۔ جی بے تابناہ اس کے پیچے دوڑا لیکن

فریدی گلی میں بھرے ہوئے آدمیوں کی بھیڑ میں غائب ہو چکا تھا۔

وہ لوگ پھر کھڑکیوں کے قریب آگئے اور پھر انہوں نے فریدی کو تھیٹ پا تھ پر دیکھا۔ اس سے تھوڑے ہی فاصلے پر گولیاں گز گز گزوں غبار اڑا رہی تھیں۔ ڈی۔ آئی۔ جی نے اوپر سے اُسے پھر آواز دی لیکن اس نے سر اٹھا کر دیکھنے کی بھی رحمت گوارا نہیں کی۔ اس کی نظریں پاپ پر جھوٹی تھیں اور پھر وہ جل پرالوگ پیچنے لگے۔ پھر اس نے اتنی تیزی سے سڑک پار کی جیسے پہلی چک کی ہو۔ دوسرے فٹ پا تھ پر جھیچ کر وہ مڑا اور ڈی۔ آئی۔ کی طرف دیکھ کر ہاتھ بلانے لگا۔ ”ہے کوئی اس کی نکر کا۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نہ پڑا۔ یہ بھی عجیب تھم کی تھی۔ کچھ گلوگیری جس میں شاید کچھ آنسوؤں کی نبی بھی شامل تھی۔ حقیقتاً اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

”زندہ باو بیٹھے از ندہ باد۔“ وہ ہاتھ مل کر بڑھا۔

فریدی نے نچلے سارے دروازوں پر نظریں دوڑا میں لیکن سب کے سب بند تھے۔ تیری منزل کی ایک کھڑکی کھلی نظر آرہی تھی اور اسی سے ملا ہوا ایک موٹا سا پاپ تھا جو نیچے نک چلا آیا

”وہ... وہی تمہارا مسٹر کیو ہے۔ تم کنوں تو نہیں۔“

”جی ہاں... جی ہاں... آپ کون ہیں... کہاں سے بول رہے ہیں۔“

”فریدی... چپ چاپ پڑی رہو۔ وہ کس کمرے میں ہے۔“

”لا بہریری کے قریب والے میں جس میں مشینیں نہ ہیں۔ فریدی صاحب خدا کے لئے مجھے بچائیے۔ اس نے سب کو مارڈ الاتادرہ... کر غل کی بہن کو بھی۔“

”لیکن... اس نے تھا۔ ان سکھوں کو کس طرح مارڈا۔“

”اوہ... بڑے خوفناک طریقے سے۔ اس نے عمارت میں داخل ہوتے ہی سکھوں کو انہما کیا اور کہا کہ منڈر کیو کا حکم ہے کہ تم سب اوپر چلو۔ پھر اس نے ان سکھوں کو اوپری منزل پر لے جا کر چھٹ کے سرے پر بکھڑا کیا۔ خدا کی پناہ میں بھی انہیں میں تھی۔ پھر اچانک اس نے ایک برین گن اٹھائی اور گولیاں بر سانے لگا۔ اس کی آنکھوں میں خون تھا اور وہ انہیں ہاہو رہا تھا۔ میں کسی نہ کسی طرح نکل گئی اور اب میں اس کمرے میں پھنسی ہوئی گولیوں کی آوازیں سن رہی ہوں۔ خدا کے لئے جلد پہنچے۔“

”اچھا لڑکی۔“ فریدی ایک طویل سانس لے کر بولا۔ ”چپ چاپ پڑی رہو۔ میں آرہا ہوں۔“ وہ رسیور رکھ کر جانے کے لئے مڑا۔

ڈی۔ آئی۔ جی وغیرہ بھی اُسی کمرے میں آگئے تھے۔

”کیسے جاؤ گے۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے پوچھا۔

”جس طرح بھی بن پڑے گا۔ جانا تو ہے ہی۔ وہ تھا ہے اور ایک مشین کے ذریعہ ان بندوقوں کو کٹرول کر رہا ہے۔“

”نبیں... اس حالت میں.... بھلا میں کیسے جانے دوں گا۔ اب میرے خیال سے اسے ٹھکنے ہی دو۔ لوگ ہوشیار ہو گے ہیں اور اب کسی کے مرنے کا امکان نہیں۔ ڈی۔ آئی۔ جی نے

اس کے کانہ ہے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”وہاں ایک زندگی خطرے میں ہے۔ ایک ایسی لڑکی جس سے ہمیں تھوڑی بہت مدد بھی ملی ہے۔ میں اُسے اس کے رحم و کرم پر کسی طرح نہیں چھوڑ سکتا۔“

”پاگل نہ بتو۔“ ڈی۔ آئی۔ جی اس کا بازو پکڑتا ہوا بولا۔

تھا۔ فریدی نے اپنے جو تھے اتارے کوٹ کی جیب سے روپا اور نکال کر پتلون کی جیب میں ڈالا اور کوٹ بھی اتار کر پہیں فٹ پاتھر پر پھینکا۔ اب وہ اسی پانچ کو پکڑ کر اوپر چڑھ رہا تھا۔ اسے بد قسمی ہی کہنا چاہئے کہ جب وہ اوپر پہنچ کر کھڑکی میں داخل ہو رہا تھا تو روپا اور اس کی جیب سے نکل کر نیچے فٹ پاتھر پر جا پڑا۔ فریدی نے جھک کر دیکھا اور پھر نہ اسامنہ بنا کر بڑا لایا۔ ”اوہ! جہنم میں جائے۔“

کمرہ خالی تھا۔ وہ آگے بڑھا۔ پیروں میں جو تے نہیں تھے۔ اس لئے وہ کوئی آواز پیدا کئے بغیر بہ آسانی نقل و حرکت کر رہا تھا۔

عمارت کا پورا نقشہ اس کے ذہن میں تھا۔ وہ دوسری منزل پر اتر آیا۔ مشین گنیں اب تک چل رہی تھیں۔ لا ببری ری کے قریب پہنچ کر وہ ایک لمحے کے لئے رکا پھر آہستہ آہستہ اس کمرے کی طرف بڑھا جس کا پتہ کنوں نے دیا تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نارنگ کی پشت دروازے کی طرف تھی اور وہ مجنونانہ انداز میں ایک پہنچ کو تیزی سے گھبائے جا رہا تھا۔ فریدی پنجوں کے مل چلتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور پھر یکخت ڈاکٹر نارنگ پر ٹوٹ پڑا۔ ڈاکٹر نارنگ کی دخی سانپ کی طرح پلتا اور پہیہ اس کے ہاتھ میں چھوٹ گیا۔ دونوں گھٹے گئے تھے۔ ڈاکٹر نارنگ کی پاگل کتے کو طرح فریدی کو ٹھنڈھوڑ رہا تھا۔ ایک تو دیسے ہی کافی طاقتور تھا اور پھر اس وقت کا کیا پوچھنا دوسرا ہی لئے فریدی کی قوت جواب دینے لگی۔ گولیوں کی آواز بند ہو گئی تھیں۔ فریدی نے اپنی پوری قوت سے نارنگ کی گرفت سے نکلنے کی جدوجہد شروع کر دی۔

”خبردار نارنگ۔“ دفعتاً دروازے کی طرف سے ایک نسوی آواز آئی۔ ”الگ ہٹو رنہ گولی مار دوں گی۔“

کنوں دروازے میں روپا اوز لئے کھڑی تھی۔ نارنگ کے حلق نے عجیب طرح کی ڈراؤنی آواز نکلی اور فریدی کو بس اتنا محسوس ہوا کہ جیسے وہ بھی نارنگ ہی سے لپٹا ہوا کوئی فٹ اچھل گیا۔ آواز نکلی اور فریدی کو اس نے کنوں کی گھٹی گھٹی سی جیچ سکی۔ نارنگ ایک ہاتھ سے فریدی سے نپٹ رہا تھا اور ہو۔ پھر اس نے کنوں کی گھٹی گھٹی سی جیچ سکی۔ نارنگ کے ہاتھ سے جو تھے اسے روپا اور دوسرے سے اس نے کنوں کو دبوچ رکھا تھا۔ کنوں کے ہاتھ سے جو تھے اسے روپا اور نکل کر دور جا پڑا۔ وہ کنوں کو نہی طرح دبارہ اتھا اور کنوں کے حلق سے ایسی آوازیں نکل رہی تھیں جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہو۔ فریدی نے باسیں ہاتھ سے ڈاکٹر نارنگ کی ناک دبا کر ایک زور دار جھکا دیا اور اس کا سر اس کی

باہمیں بغل کے نیچے آگیا۔ فریدی کی گرفت سخت ہوتی گئی۔ دابنے ہاتھ سے وہ کنوں کو الگ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو اس نے جھلا کر نارنگ کی گدی پر ایک گھونسہ رسید کر دیا۔ اس نے کنوں کو چھوڑ دیا اور وہ بے جان کی فرش پر آر ہی۔ ڈاکٹر نارنگ فریدی کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ فریدی کا دوسرا گھونسہ اس نے کہ پیٹ پر پڑا اور وہ بللا کر دوہر اہو گیا۔ اس کا سر فریدی کی گرفت سے نکل گیا تھا۔ قبل اس کے کہ وہ سنبھالتا تیرا گھونسہ اس کی ناک پر پڑا اور وہ کسی مرتبے ہوئے ہمیسے کی طرح ذکر اکر چلتا ہو گیا۔

ذوبھے لمحے میں فریدی اس کے سینے پر سوار تھا اور اس کے ندر کے والے ہاتھ نارنگ کے چہرے پر گھونسوں کی بارش کر رہے تھے۔

پولیس آگئی۔ ڈی۔ آئی۔ جی ساتھ تھا۔ فریدی نارنگ کو چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ نارنگ بے ہوش تھا۔ فریدی کسی شرابی کی طرح لڑکھڑا رہا تھا۔ قمیض نارنگ ہو گئی تھی۔ بال بکھرے تھے۔ چہرے پر کئی جگ سے خون رس رہا تھا۔ ڈی۔ آئی۔ جی نے اسے سہارا دینا چاہا گیا۔ وہ جھپٹ کر کنوں کے پاس پہنچا جو بے حس و حرکت فرش پر پڑی ہوئی تھی۔

”یہ ابھی زندہ ہے۔“ فریدی پاگلوں کی طرح حلق چھاڑ کر چینا۔ ”جلدی کرو۔ اسے ہسپتال لے جاؤ۔ جلدی۔۔۔ نفس کمزور چل رہی ہے۔“

بے ہوش نارنگ کے ہتھیاریاں رکادی گئیں۔ اسے اٹھانے سے پہلے کنوں کو دہاں سے ہٹا دیا گیا۔ فریدی نے فاتحانہ انداز سے نارنگ کی طرف دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر سکراہٹ پھیل گئی جو اسی کے چہرے سے بنے ہوئے خون میں ڈوبی ہوئی تھی۔

ڈی۔ آئی۔ جی اسے سہارا دیئے ہوئے اپنے رومال سے اسکے چہرے کا خون خشک کر رہا تھا۔ ”اُسے ہسپتال بھجوادیا۔“ فریدی نے آہستہ سے پوچھا۔

”ہاں! ہاں!.... تم مطمئن رہو۔ سب ٹھیک ہو رہا ہے۔“

”درندہ۔“ فریدی نے نارنگ کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”اور ایک ہاتھ سے بھی زیادہ طاقتور اپنے نہیں اور کون کون سی جیوانی تو میں رکھتا ہے۔ ایک ترہ سلسلے سانپ کی طرح ہونٹا نیز بھی کر سکتا ہے۔ کرٹل کی بہن کو اس نے پہنچا نرم ہی کے اثر میں لے رکھا تھا اور وہ را لکھن بھی بیہیں کہیں ہو گی۔ وہ بے چاری لڑکی... اس کی لاش بھی بیہیں کہیں ہو گی۔“

"اچھا! اب تم چلو پہاں سے۔" ذی۔ آئی۔ جی بولا۔

"اوپری منزل پر کچھ لاشیں ضرور ہوں گی۔"

"اوه.... چھوڑو... سب دکھے لیا جائے گا... چلو۔" ذی۔ آئی۔ جی نے اسے دروازے کی

طرف دھکیلتے ہوئے کہہ دی۔ "مگر نہیں پچھلی طرف سے چلیں گے۔ سڑک پر مجھ تھیں اور مجرم کو دیکھنے کے لئے بے تاب سپے۔"

وہ دونوں پچھلے دروازے سے نکل کر دوسرا سڑک پر پہنچ۔ ذی۔ آئی۔ جی نے ایک سب اسکی سے کار لانے کے لئے کہا۔

"میں شاید نسلگے پیر ہوں۔" فریدی ہنس کر بولا۔ "اور میرے جسم پر چیختہ ہیں۔"

"محظے انسوس ہے کہ تمہارا کوٹ اور جوتے نہ جانے کہاں ہوں گے۔ زیوال اور تو اٹھالیا گیا تھا لیکن ان کی طرف دھیان نہیں گیا۔"

اس سڑک اور ساگر میں سے ایک سوچیں لا شین اٹھائی گئیں۔ شہر میں ایک بار پھر خوف وہر اس پھیل گیا تھا۔ لوگوں کو اس کی خوشی تو ضرور تھی کہ ایک اتنا خوفناک مجرم گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن ساتھ ہی وہ دل گرفتہ بھی تھے کہ ایک دن میں ایک سوچیں جانیں چلی گئیں۔ زیادہ تر لوگوں نے پہلے اسے افواہ ہی تصور کیا کہ مسٹر کوڈاکٹر نارنگ تھا۔ لیکن پھر یقین تو کرنا ہی پڑا۔ سرجنت حمید اور ناگر نے طالوت جھشی اور نادرنہ کی لا شیں شاخت کیں۔

## مسٹر کیوں عدالت میں

محکمہ سراج رسانی کا ہال کچھ بچھ بھرا ہوا تھا۔ شہر کے سارے بڑے حکام موجود تھے۔ انور اور رشیدہ کو پہلی صاف میں جگد ملی تھی۔ سرجنت حمید ناک بھوں چڑھائے پھٹا پھٹا پھر رہا تھا۔ فریدی کی تقریر کے دوران میں ایک مرتبہ بھی اس نے ہال میں قدم رکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ کیس کی تعمیر کے بعد فریدی ایک لمحے کے لئے رکا اور پھر جمع پر ایک اچھتی سی نظر ڈال کر بولا۔ "ہاں تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ مسٹر کیوں کی شخصیت بڑے عجیب طریقے پر پرداز میں تھی۔ مجھے پہلے ہی سے علم تھا کہ سیکرٹ سروس کے پانچ آدمی اس نام کو استعمال کر رہے ہیں۔ میں ان کے ٹھکانے سے واقف نہیں تھا۔ لیکن اس اطلاع کے بعد ان کے متعلق چھان بین کرنا ضروری

ہو گیا۔ بہر حال مختصر ایک کہ میں نے ان کے ٹھکانے کا پتہ تو لگایا لیکن نہ توان کے ٹرانسپلر کا سراغ ملا اور نہ خود ان کا۔ کافی غور و خوض کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ انہیں شاید مجرموں نے ختم ہی کر دیا۔ لیکن سیکرٹ سروس کا ہیڈ کوارٹر برادری کی کہے جا رہا تھا کہ وہ نہ صرف موجود ہیں بلکہ اپنی تھخواہیں بھی لے رہے ہیں۔ بات عجیب تھی۔ مگر میں اپنے ہی نظریے پر جمارتا۔ آخر آج ڈاکٹر نارنگ نے اس بات کا اعتراف کری لیا کہ اس نے ان پانچوں کو ختم کر کے ان کی چیزوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ ایک طرف وہ انہیں اپنے جرائم کا بھی آلہ کار بناتا رہا اور دوسری طرف سیکرٹ سروس کے ہیڈ کوارٹر سے بھی رابطہ قائم رکھا تھا کہ ان پانچوں کی تھخواہیں تک حاصل کر تازہ۔ اس طرح وہ حکومت کے اہم رازوں میں بھی دخیل ہو گیا۔

"لیکن اس کا مقصد کیا تھا....؟" کسی نے سوال کیا۔

"مقصد.... اس نے اپنے خلاف لگائے ہوئے الزامات کا اعتراف کر لیا ہے لیکن.... مقصد مقصود کے متعلق کہتا ہے کہ اس کا انتہاء عدالت ہی میں کرے گا۔"

"تمہارا کیا خیال ہے؟" ذی۔ آئی۔ جی نے بے چینی سے پوچھا۔

"میرا خیال! میرا خیال یہ ہے کہ ان کے سارے جرائم کے پس منظر میں کوئی اہم تنظیم نہیں تھی۔ اگر اس نے اقتدار حاصل کرنے کے لئے ایسا کیا تھا تو میدان سیاست کے بہترین کھلاڑیوں کو اپنے بیس میں کرنے کی کوشش کرتا لیکن اس کے بر عکس اس کے آدمیوں میں بھی قانون کے مجرم نظر آتے ہیں۔ معمولی چور اچکے، قاتل، سازشی اور قانون ناجائز اشیاء کی تجارت کرنے والے۔ بہر حال میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ سب کچھ محض دہشت اور انتشار پھیلانے کے لئے تھا اور وہ بھی قطعی بلا مقصد! میں اسے ایک طرح کا جنون ہی سمجھنے پر بجور ہوں۔ میرا دعویٰ ہے کہ ڈاکٹر نارنگ کی خطرناک کو مپلکس کا شکار ہے۔"

"خبر یہ بات بھی کھل ہی جائے گی۔ تم اپنا بیان جازی رکھو۔" ذی۔ آئی۔ جی نے کہا۔

"اس کے ساتھی ناگر کی مصنوعی خود کشی کے متعلق تو ہاتھی چکا ہوں۔ اگر ایسا نہ کرتا تو ڈاکٹر نارنگ اسے کسی حال میں بھی زندہ نہ چھوڑتا۔ اس کا طریقہ شروع ہی سے یہ رہا ہے کہ اگر وہ اپنے کسی ساتھی کے متعلق یہ محسوس کر لیتا تھا کہ وہ پولیس کے ہمچھے چڑھ جائے گا تو وہ اسے زندہ ہی نہیں چھوڑتا تھا۔ مقصد اس کا یہ تھا کہ مسٹر کیوں کا نام بھی پرداز ہی میں رہے۔ بہر حال میری

احتیاط سے اتنا تو ہوا کہ ناگر بخاگیل۔ لیکن مسٹر کیو کو اس کی خود کشی پر یقین نہیں آیا تھا۔ اس نے اس نے خود ہی اپنا نام اپنے ہی ذریعہ سے ظاہر کر دیا۔ اس میں بھی اس کی ایک گہری چال تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ خود ہر طرح کے شہباد سے بالاتر ہے۔ چونکہ سب سے پہلے اس کا دبی بندگ مکہ سراغِ رسانی کے ایک فرد سخت حید کو مشتبہ معلوم ہوا تھا اس لئے اس نے ہر طرح سے اپنی صفائی ضروری سمجھی اور میں تو ہیاں تک کہنے کے لئے تیار ہوں کہ اگر حید کو اس بندگ میں وہ جادو نہ پیش آیا ہو تا تو ہم آج بھی ان سارے جرائم کی رو رواں سے ناداً فاق ہوتے۔ ڈاٹر نارنگ نے اپنے ساتھیوں کی اس محافت پر پرده ڈالنے کے لئے اتنے پاپڑ بنیے کہ اس سے غلطیاں ہی سرزد ہوتی چلی گئیں اور نتیجے کے طور پر اسے قانون کی گرفت میں آ جانا پڑا۔... ہاں تو... کرنل فرید کے سیکریٹری ساجد اور نارنگ کے ساتھی ناگر کے بیان سے مجھے اس کے طریقہ کار کا علم ہوا جو بڑا عجیب تھا۔ وہ ایسے مجرموں کو بیلک میل کر کے اپنے گروہ میں شامل کر لیتا تھا جن کے جرائم سے پولیس بھی لا علم ہوتی تھی اور اس کے لئے وہ سیکرت سروس والوں کا امیر نسیمیر استعمال کرتا تھا۔ اس طرح وہ اپنے ساتھیوں کے لئے بھی معہ بنا ہوا تھا۔ اس نے یہ چیز بھی ان کے ذہن نہیں کرداری تھی کہ اگر ان میں سے کسی نے کبھی مسٹر کیو کی شخصیت کار از معلوم کرنے کی کوشش کی تو شتم کر دیا جائے گا اور اس نے کئی آدمیوں کے ساتھ یہی بر تاؤ بھی کیا۔ صرف ساجد ہی ایسا تھا جو بچ گیا۔ وہ بھی اگر پاگل خانے کی راہ نہ لیتا تو اس کی زندگی بھی ناممکن تھی۔

”بھی... وہ جعفری والا واقعہ۔“ ذی۔ آئی۔ جی۔ مضطربانہ انداز میں بولا۔

”اسی کی طرف آ رہا ہوں۔“ فریدی نے مسکراتے ہوئے تقریر جاری رکھی۔ جب مجھ پر اور حید پر حملہ ہوا تو میں نے یہی مناسب سمجھا کہ روپوش ہو جائیں۔ مجھ سے دراصل ایک زبردست غلطی ہوئی تھی۔ اس ماںکر و فون والے واقعہ میں بھی مجھے رازداری ہی بر تی چاہئے تھی۔ بہر حال مجھ پر وہ حملہ ڈاکٹر نارنگ کی جلاہست ہی کا نتیجہ تھا۔ اس طرح میں نے اس کا ایک سمجھ العقول حرہ قطبی پیکار کر دیا تھا۔“

”وہ اڑنے والی رانقل کہاں ہے۔“ متعدد آوازیں آئیں۔

”ابھی تک نہیں پر آمد ہو سکی۔ ڈاکٹر نارنگ نے ابھی تک اس کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔ بہر حال میں اپنی روپوشی کے لئے کسی اچھی سی جگہ کی تلاش میں تھا اسی دوران میں میں نے فیصلہ

کیا کہ ایسی صورت میں کسی ایک جگہ رہنا ممکن نہیں تھا۔ بھی میں شہر ہی تک محدود تھا کہ ساجد اور ناگر کے تجربات کا علم ہوا اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مسٹر کیو پر ہاتھ ڈالنے کا ایک طریقہ ہو سکتا ہے کہ میں بھی مجرموں کا رول ادا کر کے اس تک پہنچوں۔ کچھ ایسے جرائم کروں جو مسٹر کیو کو اپنی طرف متوجہ کر لیں اور وہ مجھے بھی بلک میل کر کے اپنے گروہ میں شامل ہونے پر مجرور کرے۔ میں اسی ادھیزِ بن میں مصروف ایک شام راجروپ مگر کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں ایک کار اٹی ہوئی کار پر نظر پڑی۔ وہ غالباً ایک درخت سے ٹکرا کر اٹی تھی۔ وہ سڑک عموماً ویران ہی رہتی ہے۔ اس لئے شاید ابھی تک کسی نے اس طرف دھیان نہیں دیا تھا۔ بہر حال اس کار میں مجھے جیس ایڈ جعفری کا جزل نیجر جعفری دکھائی دیا جو بہت زیادہ زخمی ہو گیا تھا۔ اس کے منہ سے شراب کی بو آرہی تھی۔ بس اسی وقت اچانک میری اسکیم مرتب ہو گئی۔ جعفری دیکھنے میں خاصا ڈراوٹا معلوم ہوتا ہے اور کچھ خبطی سا بھی ہے۔ شہر میں نہیں رہتا۔ دیہاتوں اور غیر آباد مقامات پر اس نے چھوٹے چھوٹے مکانات بنا رکھے ہیں۔ انہیں میں اس کا قیام رہتا ہے۔ میری اس کی یو نہیں رکی سی ملاقات تھی۔ میں نے سوچا اس سے کام لیتا زیادہ مناسب رہے گا۔ میں نے اسے اٹی ہوئی کار سے نکال کر اپنی گاڑی میں ڈالا اور راجروپ مگر کی طرف بروانہ ہو گیا۔ وہاں میں نے جعفری کو اپنے ایک دوست ڈاکٹر شوکت کے پردو کیا اور اسے ساری باتیں سمجھا دیں۔ مجھے تو قع بھی تھی کہ جعفری کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہو گا اور یہی ہوا۔ وہ ہوش میں آنے کے بعد ڈاکٹر شوکت ہی کا مہمان رہا۔ بہر حال اس کے دفتر میں کسی کو میرے متعلق ذرہ برابر بھی شبہ نہ ہوا اور دھیان ہی کیوں دیتا۔ دفتر والے تو اس سے لرزتے ہی رہا کرتے تھے۔... پھر میں نے رشیدہ کو اس کے دفتر میں جگہ دی۔ شروع ہی سے ارادہ تھا کہ اپنے جرائم کے ذریعہ رشیدہ ہی کو بناوں گا۔ اسے اس کا ذرہ برابر بھی علم نہ تھا کہ وہ فریدی جس نے اسے وہاں ملازمت کرنے کی ترغیب دی ہے۔ خود ہی جعفری بھی ہے۔ اس طرح اس کے دل میں بناوٹ نہیں ہونے پائی۔... جس دن دفتر کی تلاشی ہوئی اسی دن میرا نام مسٹر کیو کی لست میں آگیا۔ اس کے آدمی میرے متعلق اور زیادہ معلومات فراہم کرنے کی کوشش کرتے رہے۔... اس کے گروہ کی ایک لڑکی کنوں نے اس کا پتہ لگایا تھا کہ اس تلاشی میں رشیدہ ہی کا ہاتھ تھا۔ بہر حال میں رشیدہ کو لے اڑا۔ مسٹر کیو کا کوئی آدمی میری کار کا تعاقب کر رہا تھا میں نے اس کا ایک ناٹر پھاڑ دیا۔ محض اسے نیا باور کرانے کے لئے ک

میں اُسے پولیس کا کوئی آدمی سمجھا ہوں۔ جس مکان میں رشیدہ کو لے گیا تھا وہ جعفری ہی کا ہے اور ایک غیر آباد مقام پر واقع ہے۔ میں نے کئی دنوں سے وہیں بودو باش اختیار کر کی تھی اور برابر یہ محسوس کرتا رہا تھا کہ اس کی نگرانی ہو رہی ہے۔ لیکن میں ظاہر ہے پردا نظر آتا رہا۔۔۔ ہال تو جب میں رشیدہ کو باندھ رہا تھا تو ہم پر ایک تیز قسم کی روشنی پڑی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کسی فلیش کیبرے کی ہے۔ اس پر میں نے چینچ چلا کر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ وہ کسی پولیس والے کو حرکت تھی۔ میں نے عذر ارشیدہ سے ساری گفتگو اونچی آواز میں کی تھی۔ لیکن اب یہ سوچ رہا تھا کہ کہیں اسے مشریک کے آدمی نہ اٹھائے جائیں۔ کیونکہ انہیں کسی ایسے آدمی کی شدت سے ضرورت محسوس ہو رہی تھی جو فریدی کا پہاڑ اور نشان جاتا ہو۔۔۔ دوسرے دن صبح ہی میں نے رشیدہ کو بے ہوش کر کے ایک ٹرک میں ڈالا اور اس کے اوپر پیال لاد دی۔ اس طرح اسے بھی راجروپ گلر پہنچایا۔ اس وقت میں جعفری کی ٹھکل میں نہیں تھا۔ مگر انی کرنے والے اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے تھے۔ اس نے میدان صاف تھا۔۔۔ دوسرے دن آفس میں مجھے وہی تصویر ملی تھی میں نے بعد میں انور کو سمجھ دی تھی۔ تصویر کے ساتھ ہی مشریک یا کا ایک دھمکی آمیز خط بھی تھد اس نے لکھا تھا کہ اگر میں اس کے گروہ میں نہ شامل ہو اور اس کے احکامات کی تعییں تکی تو“ تصویر پولیس کے حوالے کر دی جائے گی۔ میرا جواب اس نے ایکسپریان جگہ پر مانگا تھا۔ میں نے جواب لکھ کر وہاں رکھ دیا۔ خط و کتابت جاری رہی۔ جس کے ذریعے اس نے مجھے کئی جرام تھے ترغیب دی۔ بہر حال میں پیغام رسائی کے طریقے کا راز جاننے کا کوشش رہا۔ پھر مجھے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ اس کے خطوط کئی ہاتھوں سے گزرتے ہوئے مجھے سملک تھیتھی ہیں۔ اسی طرح وہ خط بھی کئی ہاتھوں سے گزرتا ہوا ساگر میشن تک پہنچا تھا اور پھر وہاں سے اسے کوئی ناس سر کبوتر ڈاکٹر نادگ تک پہنچا دیتا تھا اور ڈاکٹر نارنگ کا نائب کیا ہوا خط کبوتر ہی کے ذریعے ساگر میشن تک پہنچتا تھا جس کی دنوں تک ان کبوتروں کا تعاقب کرنا پڑا۔ اب جا کر یہ راز کھلا کر وہ ڈاکٹر نارنگ کی کوئی پر اترتے ہیں۔ پھر میں نے اپنی کئی راتیں چوروں کی طرح ساگر میشن اور نارنگ کی کوئی تکمیل کی خلافی میں صرف کیس اور جب مکمل طور پر اس بات کا یقین ہو گیا کہ اصل مجرم نارنگ ہی ہے تو میں نے وہ تصویر انور کو سمجھ دی۔ جب جعفری کے دفتر کی طلاقی ہو رہی تھی تو اس وقت میں سرک ہی پر موجود تھا۔ لیکن دوسرے بھیں میں۔ ذی۔ آئی۔ جی کی واپسی پر میں نے انہیں ڈاکٹر

نارنگ کی طرف سے فون کیا۔۔۔ اور پھر جو کچھ بھی ہوا آپ جانتے ہیں۔“  
تمام واقعات صاف ہو چکے تھے لیکن لوگ نارنگ کا بیان سننے کے لئے بے تاب تھے۔ جس دن عدالت میں ڈاکٹر نارنگ کا بیان ہونے والا تھا کہیں تل رکھنے کی بھی جگہ نہیں تھی۔ صرف خواص ہی کا داخلہ ہو سکا تھا۔ عوام سڑک پر اور عدالت کے صحن میں بھرے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نارنگ نے بڑی شرافت سے استدعا کی تھی کہ باہر والوں تک اس کی آواز بچنے کے لئے مانگو فون کا انتظام کیا جائے۔ پہلے اس کی یہ درخواست مسترد کر دی گئی لیکن جب اُس نے اس بات کا یقین دلایا کہ ملک کے مفاد کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہے گا تو درخواست منظور کر لی گئی اس نے یہ بھی کہا کہ اگر وہ کوئی ایسی بات شروع کرے تو مانگو فون کا سلسلہ منقطع بھی کیا جاسکتا ہے۔۔۔ بڑی عجیب درخواست تھی۔

نارنگ قیدیوں کے کپڑے پہنے ہوئے تھے میں بیٹھا تھا۔ لیکن یہ بڑی عجیب بات تھی کہ وہ پہلے سے بھی زیادہ تدرست نظر آ رہا تھا۔ چھرہ سرخ تھا اور آنکھوں میں عجیب طرح کی چک نظر آ رہی تھی۔ جب وہ اپنی بیان دینے کے لئے کھڑا ہوا تو عدالت میں ستانچا گیا۔ پھر حلف دینے کی رسم شروع ہونے والی تھی کہ اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”کسی موہوم ہستی کو درمیان میں لانے کی ضرورت نہیں میں جو کچھ بھی کہوں گا کچھ ہی کہوں گا۔ البتہ میں بتتے ہوئے خون کی قسم کھا سکتا ہوں۔ کیونکہ خون ریزی ہی میرا مذہب رہا ہے۔ توگ میرے جرام کا مقصد جانے کے لئے بے تاب ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ جو مقصد کسی مذہب کا ہو سکتا ہے وہی میری خونریزی کا بھی تھا۔ مذہب انفرادی اور اجتماعی سکون کا ذریعہ ہے اور میں صرف انفرادیت میں یقین رکھتا ہوں مخف اس لئے کہ اجتماعی زندگی نے مجھے حرای قرار دیا تھا۔

حرای اہاں میں حرای ہوں۔۔۔ میری سبیل گی پر کئی منہ جیرت سے کھل گئے ہیں۔۔۔ کچھ مگر اب بھی رہے ہیں اور آزر میں چیف جسٹس یہ سوچ رہے ہیں کہ شاید اب میں پاگل پن کا ڈھونگ رچانے جا رہا ہوں۔ اپنے کپڑے پھاڑاں کا اور پھر اس وقت تک پچانی سے پچار ہوں گا جب تک مجھے پاگل خانے میں قیام کرنا پڑے گا۔۔۔ نہیں میں باہوش و حواس کہہ رہا ہوں کہ میں حرای ہوں۔ میں اپنی ماں کی شادی کے نٹیک پانچویں میتھے میں پیدا ہوا تھا۔ اس سانچے پر اس نے تو خود کشی کر لی تھی لیکن وہ شخص جس سے اُس کی شادی ہوئی تھی۔۔۔ میں اس کا تذکرہ اتنے عامیانہ

کہتے ہیں کہ حرای ہر حال میں مرنے سے قبل خود کو جہنم کا مستحق بنا لیتا ہے پڑے حرای کو راہ مستقیم سے بھی محروم کر دیا گیا۔ پھر آخر کیا کرے کہاں جائے۔ بتاؤنا... بلو... جواب دو۔“

ڈاکٹر نارنگ خاموش ہو کر مجھ کو کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔

”کوئی نہیں بولے گا۔“ اس نے زہر خند کے ساتھ تقریر پھر شروع کر دی۔ ”میں بہت آگے بڑھ آیا۔ لوگ یہ جانے کے لئے بیتاب ہوں گے کہ ایک حرای ایم۔ پی کیسے بن گیا۔ اسے یہ حق کس طرح حل گی۔ میں انہیں مایوس نہ کروں گا۔ ہاں تو میں اس ہوٹل سے فرار ہو گیا اور یہ تھیہ کر لیا کہ کسی ایسی جگہ چلا جاؤں گا جہاں مجھے کوئی جانتا نہ ہو۔ میں اس میں آج تک کامیاب رہا۔ میں نے گھٹیا سے گھٹیا مزدوریاں کیں مگر تعلیم نہ چھوڑی۔ سیاست میں ایم۔ اے کرنے کے بعد میں باقاعدہ طور پر میدان سیاست میں اتر آیا تکن وہ حرای والا کو مپلکس اب بھی مجھے بے چین کئے ہوئے تھا۔ مجھے آدمی سے نفرت تھی۔ میں سوچتا تھا کہ اگر کسی کو یہ معلوم ہو گیا کہ میں حرای ہوئے تھا۔ میں اس کے لئے بس کر کے مجھے سچی خوشی حاصل ہوتی تھی۔ مجھنگلاہت نے میری خون کی پیاس بڑھا دی۔ کسی بھی آدمی کو بے بس کر کے مجھے سچی خوشی حاصل ہوتی تھی۔ میں ایک ایسے مبارک وقت کے خواب دیکھا کرتا تھا جب ایک ایسی قوت میرے ہاتھوں میں ہو کر لوگ اس کے آگے بے بس ہو کر رہ جائیں۔ مجھے اقتدار کی خواہش نہیں تھی۔ میں تو لوگوں کو خوفزدہ دیکھنا چاہتا تھا۔ زخمیوں کی کراہیں اور مرنے والوں کی بچکیاں سننا چاہتا تھا۔ میں حرای تھا اس لئے خود کو جہنم کا مستحق بنا رہا تھا۔... جہنم....!“

نارنگ نے رک کر قہقهہ لگایا۔ ”جہنم.... کیا شہر اس دوران میں جہنم نہیں تھا کیا میں اس جہنم کا مستحق ہرگز نہ بنت۔ میرا خیال ہے کہ دنیا کے نیک اور شریف آدمیوں میں کم از کم پانچ فیصدی حرای ضرور ہوں گے لیکن وہ اس لئے قابل نفرت نہیں ہیں کہ ان کی ماوں نے انہیں یہ نہ بتایا ہو گا کہ وہ حرای ہیں۔ لہذا وہ سو فیصدی بہشت کے مستحق ہیں۔“

ڈاکٹر نارنگ کی آواز دھمی پڑ گئی اور وہ مسکرا کر بولا۔ ”میں نے اپنے جرام کا اعتراف کر لیا ہے اور ابھی میں بعض مضمکہ خیز قسم کے فیصلے سنوں گا۔“

”آرڈر.... آرڈر....!“ مجھ میز پر ہاتھ مار کر بولا۔

”میں اب بھی وقت کا سب سے بڑا آرڈر ہوں۔“ ڈاکٹر نارنگ نے قہقهہ لگایا۔ ”اس مقدمے

انداز میں کر کے اس کی توبین کر رہا ہوں.... وہ دنیا کا عظیم ترین شخص تھا میں تو اسے خدا نک کہنے کے لئے تیار ہوں۔ اس نے مجھے اپنے بیٹھے کی طرح پالا اور پھر دوسری شادی نہ کی.... ہوش سنجھائے پر مجھے یہ سمجھایا گیا کہ حرای کہتے کے ہیں.... میری ماں کا شوہر اس پر جھنجھلانا اور اپنی بوٹیاں نوچتا۔ گاؤں بھر سے اس نے دشمنی مول لے لی لیکن پھر بھی وہ میرے لئے دوسرے سے لٹا رہا۔ عورتیں اپنے بچوں کو میرے ساتھ کھینے سے روکتی تھیں میں بچپن ہی سے بڑا حساس تھا۔ مجھ پر عرصہ حیات نگہ ہو گیا۔ پکھے اور بڑا ہوا تو سوچنے لگا کہ آخر حرای ہوتے میں میرا اپنا کیا صورت ہے۔ میرے پالنے والے نے نگہ آکر مجھے شہر کے ایک ہوٹل میں بھیج دیا۔ بچپن ہی سے ذہین تھا۔ لکھتے پڑھنے میں دل زیادہ لگتا تھا۔ میں تعلیم حاصل کرنے میں مصروف ہو گیا۔ لیکن وہاں بھی مشکل سے ایک ہی سال سکون سے گزار پا لیا دوسرے سال اسی ہوٹل میں میرے گاؤں کے دو ایک لڑکے اور بھی آگئے۔ مجھے بھروسہ ہی آوانیں سنائی دینے لگیں.... ”ڈاکٹر نارنگ، ایک لٹکے کے لئے رکا۔ عدالت میں سنائا چاہیا تھا۔ وہ چند لمحے مجھے کو گھورتا رہا پھر گرج کر بولا۔ ”مجھے بتاؤ میں کیا کرتا۔... مجھے جواب دو؟ اگر کوئی مادر زاد لنگڑا ہو تو لوگوں کو اس سے ہمدردی ہوتی ہے۔ مادر زاد اندھے ہندوؤں میں سورہ اس اور مسلمانوں میں حافظ کہلاتے ہیں.... لیکن میں.... کیا میں بذاتِ خود ایک بہت بڑی مجبوری.... نہیں تھا، کیا میں ایک بیماری کی طرح نہیں پیدا ہوا تھا۔ اگر میں شاستر پڑھ لیتا تب بھی حرای ہی رہتا۔ اگر قرآن بھی حفظ کر لیتا تو لوگ مجھے حافظ کہتے ہوئے بچکھاتے۔ آخر کیوں! کیا میں بھی ایک لنگڑے یا اندر ہے کی طرح اپنی پیدائش کے معاملے میں بس نہیں تھا۔... زانی اور زانیہ اگر تائب ہو جائیں تو خدا ان کے گناہ معاف کر دیتا ہے لیکن میں تمہارے خدا سے پوچھتا ہوں کہ آخر اس نے حرای کو کیوں اپنے بندوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے.... وہ جس کا میں نظر نہیں ہو گی وہ اگر تائب ہو کر مولوی یا پنڈت ہو گیا تو لوگ اس کے قدم چوم رہے ہوں گے اور وہ بہشت یا سورگ کی آس لگائے بیٹھا ہو گا۔... لیکن.... میں.... میں کس طرح خود کو بدلتا ہوں۔ میں حرای ہوں۔ کوئی عادت نہیں ہوں کہ بدلتا جاؤں.... میں باضی.... حال.... اور مستقبل تینوں سے محروم ہوں۔ حال حاضر اس لئے کامیاب رہا کہ میں خود کو چھپانے میں کامیاب ہو گیا۔ اگر واقعی کوئی دوسری زندگی بھی ہے تو.... میں اس سے بھی مایوس ہوں کیونکہ بعض مذاہب حرای کو ہر حال میں جہنمی قرار دیتے ہیں

کے دوران میں میں نے کئی بار عدالت کی توہین کی ہے۔ اس لئے پھانسی کے ساتھ توہین عدالت کے سلسلے میں چھ ماہ کی سزا ضرور رکھی گئی ہو گی۔ لہذا میں عدالت سے درخواست کروں گا کہ پھانسی کے بعد ہی مجھے چھ ماہ کی سزا قید دی جائے۔“  
حاضرین کے قہقہے کی طرح رکنے سکے۔  
عدالت نے پھر میز پر موگری بجانی شروع کر دی۔  
عدالت برخواست ہونے پر فریدی بہت زیادہ سنجیدہ نظر آرہا تھا۔ حمید کے چھٹرنے پر آہستہ سے بولا۔

”اگر یہ غلط راستے پر نہ نگل گیا ہو تو برا عظیم آدمی ہوتا۔“

”اوہ نہ...!“ حمید نے بُراسامنہ بنایا۔ ”کنوں کا کیا رہا۔“

”وہ اور ناگر سرکاری گواہ کی حیثیت سے پیش ہوئے ہیں! ظاہر ہے کہ بری ہو جائیں گے۔“  
”وہ را کُفْل نہ جانے کیا ہوئی۔“

”کیا تم پچھلی کارروائیوں کے دوران سوتے رہے ہو۔ اس نے اسے اسی وقت تباہ کر دیا تھا جب میں نے ماسکر دفن کے اعتناء کے لئے آرڈر نکلوائے تھے۔“

ڈاکٹر نارنگ کی پھانسی کا منظر بھی عجیب تھا جنہوں نے اسے اس وقت دیکھا تھا ان کا بیان ہے کہ وہ گوشت و پوست کا آدمی تو معلوم ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف یا ضمحلہ کی جگہ شلگمگی تھی۔ جب اس سے اس کی آخری خواہش پوچھنے کا ذکر کر بولا۔ ”پوچھنے سے کیا فائدہ جبکہ پوری ہی نہ کی جاسکے۔ میری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ جتنے بھی موجود ہیں انہیں بڑے بے دردی سے قتل کر دوں۔ آخری خواہش پوچھنے کا ذکر حکومتہ بھی عجیب ہے! اچھا خیر چلو! اگر پوچھنا ہی ہے تو ایک بڑی معمولی سی خواہش پوری کر دو۔ میرے مرنے سے پہلے یہی کہہ دو کہ ڈاکٹر نارنگ حراثی نہیں ہے۔“

وہ تھوڑی دیر تک خاموشی سے کھڑا اس مجھے کو دیکھتا رہا جسے گویا سانپ سونگھ گیا تھا۔ پھر اس نے ایک زہریلا ساقہ قہقہہ لگایا اور بلا تکان پھانسی کے تنخے پر چڑھ گیا۔

## ختم شد